زرغونہ

سلمیٰ اعوان

الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب

غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

مجھے کچھ کہنا ہے

سارک رائٹرز کانفرنس میں میری ملاقات جواہر لال یونیورسٹی میں شعبہ International languages and cultural ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر جناب خواجہ اکرام سے ہوئی۔ بہت نفیس اور مخلص سی اس شخصیت نے چھوٹتے ہی کہا۔

ہمارے ڈپارٹمنٹ کی طالبہ پاکستانی خاتون سفرنامہ نگاروں پر پی ایچ ڈی کرنا چاہتی ہے۔ آپ سے انہیں ملانا بہت ضروری ہے۔ کتابیں بھی ہونی چاہئیں۔

میں سارک رائٹرز کی انتظامیہ کے کہنے پر اپنی چند کتابیں لائی تھی۔ رُوس اور مصر کے سفرنامے دیکھ کر اُن کی آنکھیں چمکیں۔ ایک اچھے اُستاد کی پہچان۔ میری طالبہ کی تو مشکل آسان ہوگئی۔ اُنہوں نے کتابیں مجھ سے لے لیں اور یونیورسٹی آنے کی دعوت بھی دے ڈالی۔

آنے سے ایک دن قبل میں یونیورسٹی گئی۔ مسرور صغرا سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے فوراً گلہ کیا۔ آپ کے بارے میں انٹرنیٹ پر بہت تھوڑا مواد ہے۔ میں تو سخت مشکل

میں تھی۔ کتابیں دیکھ کر حیرت ہوئی ہے کہ اتنا کام کیسے بیٹھی ہیں۔

چند لمحوں کیلئے میں نے سوچا۔ اپنے آپ سے کہا۔

واقعی اِن کاموں میں کتنی پھسڈی ہوں۔

لاہور واپس آئی تو ایجوکیشن کالج کی دو لڑکیاں آ گئیں۔ ایک کو سفرناموں پر تھیسس کرنا تھا اور دوسری کو ناولوں پر۔

چلو سفرنامے تو کچھ تھے ہی۔ مگر پرانے ناول تو میں بھلائے بیٹھی تھی۔ پلیز ہم لوگوں نے نیٹ کھولا تو آپ کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔

اب واقعی سوچنا پڑا۔ ویب سائٹ بننی چاہیے۔ آغاز کے لکھے گئے ناولوں شیبہ، ثاقب اور زرغونہ تقریباً عنقا تھیں۔ بڑی تگ و دو کے بعد ایک ایک نُسخہ کستوری کی مانند ملا۔ گرد آلود، پھٹے پرانے صفحات، ٹوٹی ہوئی جلدیں۔

ورق گردانی کی۔ ظاہر ہے سیدھے سادے رومانی قسم کے ناول تھے۔ درمیان میں گزرے وقت اور ڈھیروں ڈھیر مطالعہ نے ذہن کو کچھ بالغ کر دیا تھا۔ دو تین دن اسی سوچ و بچار میں گزار دیئے۔ پھر سوچا۔

یار جب بندہ نیا نیا جوان ہوتا ہے، جب آسمان پر کمندیں ڈالنے کو جی چاہتا ہے، جب پسینہ گلاب کی سی خوشبو دیتا ہے، جب بندہ خواہ مخواہ ہی رومانوی سا ہو ہو جاتا ہے۔ اُس دور کیلئے بھی تو کچھ ہونا چاہیئے۔ ذہنی بلوغت تو پھر دھیرے دھیرے ہی آتی ہے۔ تو ان دنوں جب جی چاہتا ہے خوبصورتیوں کی باتیں ہو۔ رنگوں اور خوشبوؤں کا ذکر ہو۔ کپڑوں کے تذکرے ہوں اور سب سے بڑھ کر ہیرو اور ہیروئنوں کا کثرت سے میل ملاپ اور محبتوں کے اظہار ہوں۔

اب سچی بات ہے ہمارا تو وہ حال تھا کہ ناول پڑھتے ہوئے ملاقاتوں میں ذرا

تعطل آجاتا۔ بیچ میں کچھ اور قصے شروع ہو جاتے تو خیر سے صفحات پلٹ پلٹ کر دیکھے جاتے کہ اے ہے یہ دونوں کہاں مر گئے ہیں؟ آنہیں پا رہے۔

یقیناً الیکٹرونک میڈیا کی دھواں دھار قسم کی تیز رفتاری نے نئی نسل کو جذبات کے اظہار کیلئے بڑا کھلا ڈلا ماحول دے دیا ہے۔ اور انہیں شاید وہ ڈھکے چھپے جذبات اور باتیں مضحکہ خیز لگتی ہوں۔ جو ہماری رگوں میں سنسنی دوڑانے کا باعث بنتی تھیں۔

سو میں نے تینوں کتابوں کو جھاڑ پونچھ کر انہیں اُسی طرح دوبارہ چھپوا دیا ہے کہ یہ میرے ابتدائی دَور کی یادگاریں ہیں اور انہیں اپنی اصل حالت میں ہی رہنا چاہیے۔

سلمیٰ اعوان

لاہور گیریژن گرامر سکول

اعوان ٹاؤن، ملتان روڈ، لاہور

0301-4038180

042-35961344

باب نمبر:ا

نصف دھڑ پلنگ پر اور نصف نیچے لٹک رہا تھا۔تابندہ کے چہرے پر ایسی اُداسی تھی جس پر دل کٹ جاتا ہے۔حسین لانبی پلکوں والی آنکھوں میں غم کی لرزتی پرچھائیاں رقصاں تھیں۔

انتہائی مترنم آواز سنگین پتھر کی دیواروں کو چھیدتی اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ہلکورے لیتی موسیقی اسے بے چین کرگئی۔بے بسی سے اس نے سر کو دائیں طرف پٹخا لیکن دوسرے ہی لمحے سر بائیں طرف تھا۔

میں اور تم سے ترک محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غم روزگار نے
اب اے دل تباہ تیرا کیا خیال ہے
ہم تو چلے تھے کاکل گیتی سنوارنے

نغمہ بار آواز رہے سہے ضبط کے بندھن توڑ رہی تھی۔ایک جھٹکے سے وہ اٹھ

بیٹھی۔اس کے دونوں ہاتھ پشت پر تھے اور نگاہیں جن میں ہیجان واضح تھا سامنے مرکوز تھیں۔

وہ کمرے میں بے چینی سے گھوم رہی تھی۔اس کی چال کبھی تیز اور کبھی دھیمی ہو جاتی۔

دریچے کا پردہ یونہی سرکا کر باہر جھانکا دوسرے گھروں کے بند دریچوں سے اڈتی روشنی کی شعاعیں گلی میں مختلف زوایے بنا رہی تھیں......

''چھن چھنا چھن''۔۔۔۔۔۔سازوں کی دلفریب تانیں فضا میں اڑ رہی تھیں۔

دل میں نفرت کی آگ پوری شدت سے بھڑکی۔اس تپش سے اس کی آنکھیں، چہرہ اور جسم جل اٹھا۔جلتی انگلیاں، جلتے پپوٹوں کی شدت کم کرنے کے لئے انہیں مسلنے لگیں۔

آواز اپنے عروج پر تھی۔ساز چیخ رہے تھے۔اور''واہ واہ'' کی بے ہنگم آوازوں سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔

افسردگی کی گہری تہوں تلے دبی وہ آہستہ آہستہ پھر اپنے پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی۔فضا میں ایک اور آواز گونجی۔

ساز بدل......نغمہ بدل گیا۔

سازینہ نغمہ خواں تھی۔

سازینہ

جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اس کی آواز میں پھولوں کا رس اور جھرنوں کا ترنم ہے۔اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔سر دھیرے دھیرے ہتھیلی پر ٹک رہا تھا۔

اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا وجود ایک ایسے ناسور کی مانند ہے۔ جس میں ہر آن خون ملی پیپ کلبلاتی ہے۔

اندوہ گیں احساسات کے تیز نوکیلے نشتر اس کی روح کے زخموں کو کرید رہے تھے۔ تڑپ بڑھ رہی تھی، بے قرار ہو کر وہ لیٹ گئی۔ لیکن سکون کہاں تھا۔ ایک لمحے سے زیادہ نہ لیٹ سکی۔

دبیز قالین ایک بار پھر اس کے خوبصورت پاؤں تلے بے دردی سے روندا جا رہا تھا۔ کمرے کا قیمتی پردہ اٹھا کر ایک معمر عورت اندر آئی۔

نووارد کی غائر نگاہوں نے چلتے پھرتے اس پیکر کو تشویش ناک انداز میں گھورا۔ پیشانی پر تفکر کی چند لکیریں نمودار ہوئیں۔ قدموں کو آگے بڑھاتے ہوئے اُس نے متفکرانہ انداز میں کہا۔

''زرغونہ، تم نے اچھا نہیں کیا۔''

رک کر پل بھر کے لئے اس نے زخمی نگاہوں سے اپنی مخاطب کو دیکھا۔ چہرے پر تلخی کا رنگ بکھر گیا۔

''یہ میں بھی جانتی ہوں۔ سمجھانے کی ضرورت نہیں۔''

اس کے لہجے میں رعونت کے ساتھ ساتھ کسی حد تک برہمی نمایاں تھی......

''ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ تمہاری ماں تمہارے طرزِ عمل سے دلبرداشتہ ہے۔''

ناصحانہ انداز میں کہا گیا۔

''میں نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی ہے۔ لیکن اپنی فطرت سے جنگ کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔''

اس کا جواب کٹیلا تھا۔

پردہ ایک بار پھر ہلا۔پینتیس چھتیس سالہ ایک حسین عورت زرق برق ساڑھی اور قیمتی زیوارت میں ملبوس کمرے میں داخل ہوئی ۔اس کی نگاہوں سے غصہ چھلک چھلک پڑ رہا تھا۔چہرہ جوشِ غصب سے تمتمار ہا تھا۔

پریشان حال لڑکی عورت کے حسن کی مکمل تصویر تھی ۔فرق اگر تھا تو صرف اتنا کہ جہاں ایک شباب کی رنگین مہکتی وادی میں قدم رکھ رہی تھی دوسری دھیرے دھیرے باہر نکل رہی تھی۔

''سرلا اس کو بتاؤ۔اسے یہ سمجھاؤ کہ میں نے اسے اپنا جانشین بنانے کے لئے جنم دیا تھا۔انوکھی زندگی کے خواب دیکھنے کے لئے نہیں ۔'' ۔۔۔۔۔۔۔آواز میں رعد کی سی کڑک تھی۔

''تمہیں احساس ہے ماں ! کہ میں تمہاری جانشین بننے کی اہلیت نہیں رکھتی ۔پھر میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیا جاتا۔کیوں مجھے بلاوجہ تنگ کیا جا رہا ہے؟ میں اس ماحول کونہیں اپنا سکتی۔میں خود کواس میں جذب نہیں کر سکتی۔''

عورت کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''کہتی ہے میں اس ماحول کونہیں اپنا سکتی۔میں کہتی ہوں آنکھوں پر پڑے اس خوش نما پردے کو اتار ڈالو۔جس کی چمک سے تمہاری آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں، جانتی ہو،اس چمک کے نیچے کیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے ہیں۔ان اندھیروں میں جھانکنے کی کوشش کروگی تو سانس گھٹ جائے گا۔'' وہ چیخی۔

''یہ اندھیرے مجھے اپنی فطرت سے قریب تر معلوم ہوتے ہیں ان کے دامن میں جھانکتے ہوئے میرا دم کبھی نہیں گھٹا۔لیکن تمہاری دنیا میں میری روح تڑپتی ہے۔''

اس کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔

اگلے ہی لمحے زناٹے دار تھپڑ اس کے رخسار پڑا۔اس کے چھوٹے چھوٹے بالوں کو بیدردی سے کھینچتے ہوئے وہ چیخی۔

''خودفریبی کا جو تانابانا تم اپنے گرد بن رہی ہو۔ممتاز بائی کو اس کی ڈوریاں کاٹنی آتی ہیں۔جس فسوں خیز خواب میں تم گم ہو۔جس سراب کے پیچھے تم بھاگ رہی ہو۔اس کی حقیقت اتنی کڑوی ہے کہ دنیا کی کوئی مٹھاس اس کی کڑواہٹ کم نہیں کرسکتی۔

''جو مٹھاس تم مجھے چکھانا چاہتی ہو ماں! میں اس کے لئے تیار نہیں۔'' لڑکی کی آواز میں عزم اور خوداعتمادی کی کھنک تھی۔

اور اتنا پرعزم لہجہ اسے بوکھلا گیا۔بار بار تمہیں یہ چیز ذہین نشین کروائی گئی ہے کہ تم ایک طوائف کی بیٹی ہو۔''

''طوائف کی؟'' وہ یک دم کسی موج کی طرح بپھر اٹھی۔

''طوائف! اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھی۔اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

''طوائف۔۔۔۔۔جو معاشرے کی چمکتی جبیں پر ایک بدنما داغ ہے۔ایک حسین جسم ایک رستا ہوا ناسور، جسے کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔تاکہ زہر جسم میں سرایت نہ کر سکے۔''

وہ ایک لمحے کے لئے رکی اور کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔

''اور تم یہ زہر دوبارہ اس معاشرے کے پاکیزہ بدن میں داخل کرنا چاہتی ہو۔ غلاظت کے اس ڈھیر کو اس صاف ستھری بستی میں دوبارہ لے جانا چاہتی ہو۔''

اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولی....

''زرغونہ ہوش میں آؤ اپنے مقام کو پہچانو۔تمہاری منزل وہ نہیں، جس کے تم سپنے دیکھ رہی ہو۔خوابوں کے یہ شیش محل ،حقیقت کی کیا ایک ہی جھلک سے نہ صرف چکنا چور ہو جائیں گے بلکہ ان کی کرچیاں تمہارے دل میں یوں پیوست ہو جائیں گی کہ عمر بھر تڑپتی رہو گی۔نکالنے کی کوشش کرو گی مگر کامیاب نہ ہو سکو گی.....جیون تمہارے لئے ایک ایسا روگ بن جائے گا جو تمہیں قبر میں پہنچا کر ہی چین لے گا۔ارے اُس پاکیزہ معاشرے نے تو ہمیں بھی مات دے دی ہے۔''

''جیون اب کیا کسی روگ سے کم ہے؟''

دانت پیستے ہوئے وہ اس کی طرف بڑھی۔اس کی گردن کو اپنی مضبوط گرفت میں لے کر چند شدید جھٹکے دیئے۔بالوں کو بے دردی سے کھینچتے ہوئے اس نے زرغونہ کے خوبصورت معصوم چہرے کو تھپڑوں سے سرخ کر دیا۔اور ہذیانی کیفیت میں چیخی۔

''اپنے ماحول سے بیزاری اور تلخ حقائق سے یہ فرار تمہیں مہنگا پڑے گا۔۔۔۔۔بازار حسن سے جنازے اٹھا کرتے ہیں۔ڈولیاں نہیں،تمہیں اس ماحول میں خود کو جذب کرنا ہوگا.....وگرنہ تم جیسی لڑکی کو کتوں سے بھی نچوایا جا سکتا ہے۔۔۔۔''

''سرلا!'' وہ کمرے میں داخل ہونے والی پہلی عورت کی طرف دیکھتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولی۔

''نواب داؤد نے مجھے مجرے کے لئے دعوت دی ہے۔اس کو بتا دینا کہ اسے وہاں جانا ہوگا۔رقص و موسیقی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔اور یہ بھی کہ اگر آج کی طرح یہ بھری محفل چھوڑ کر بھاگ آئی تو اس کی ہڈیاں توڑ دی جائیں گی۔اس کے ان نخروں کو برداشت کرنے کی مجھ میں اب تاب نہیں۔''

اس کی پیشانی شکن آلود تھی۔

''سرلا! یہاں سے فارغ ہو کر میرے پاس آنا''۔۔۔۔۔یہ کہتے ہوئے وہ پھنکارے مارتی وہاں سے نکل گئی۔

بکھرے بالوں اور تمتماتے چہرے کے ساتھ وہ وہیں کھڑی تھی متوقع آندھی تیز بگولا بن کر ان احساسات کو اڑائے لئے جا رہی تھی۔جن میں ڈوب کر چند لمحوں کے لئے وہ اس تکلیف دہ ماحول سے نکل جاتی۔اداسی کی دبیز چادر میں لپٹی وہ آرزوؤں کے اس مدفن کو دیکھ رہی تھی۔جہاں ہر شب اس کے خواب اس کے سینے دفن ہوتے۔آنکھوں سے حسرتوں کا دھواں اٹھ رہا تھا۔

''زرغونہ !'' سرلا بائی کی محبت میں ڈوبی ہوئی آواز اسے کہیں دور سے سنائی دی۔

''یہ تمہاری بھول ہے۔زمین کی پستیوں کو آسمان کی رفعتوں سے کوئی نسبت نہیں۔معاشرہ تمہارے تقدس کا کبھی احترام نہیں کرے گا۔ہر آنکھ تحقیر لئے اٹھے گی۔۔۔تمہارے جذبے کو کوئی نہیں دیکھے گا۔کوئی نہیں جانے گا۔کوئی نہیں پرکھے گا۔۔۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ آک کے پیڑ میں کبھی آم بھی لگ جاتے ہیں۔خودغرض معاشرہ تمہیں اپنے دامن میں پناہ نہیں دے گا۔''

''اف!'' اس نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

وزنی ہتھوڑوں کی ان مسلسل ضربوں نے اس کے دماغ کو پاش پاش کر ڈالا تھا۔

''مجھے تنہا چھوڑ دو.......تنہا.......تنہا'' اس کے لب آہستہ تھرتھرائے۔

ذہن میں اضطراب انگیز خیالات کے بھنور اٹھے۔

''تو طوائف کی بیٹی ہے۔اور طوائف معاشرے کی چمکتی جبیں پر ایک بدنما داغ

ہے۔'' بازارِ حسن سے ڈولیاں نہیں ۔۔۔۔۔۔جنازے اٹھا کرتے ہیں ۔پستیوں کو رفعتوں سے کوئی نسبت نہیں ۔۔۔۔۔''

یہ بھنوراس کا مقدر تھے۔جن سے باہر نکلنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔آنسو اس کے رخساروں پر تیزی سے لڑھک رہے تھے۔

''تمہیں اس ماحول میں خود کو جذب کرنا ہوگا۔''

ماں کی پاٹ دار آواز اس کے تصور میں گونجی۔

سرعت سے ہاتھ کانوں پر چلے گئے۔

لیکن یہ مدافعتی سہارا کتنا کمزور تھا۔وہ تڑپ اٹھی۔

''مجھے تم سے پوری پوری ہمدردی ہے لیکن تو نہیں جانتی سرلا بائی کے پاؤں میں کتنی مضبوط زنجیریں ہیں ۔اپنے ماحول سے نکل کر تو کہاں جائے گی؟ کوٹھوں پر رہنے والیوں کو باہر کی دنیا کبھی راس نہیں آئی ۔یہ سمجھ لے اور خود کو اس دنیا میں مدغم کر لے۔بہتری اسی میں ہے؟''

''بہتری اسی میں ہے۔''

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی وہ باہر نکل گئی۔

''خدایا!'' وہ شاکی انداز میں بڑبڑائی۔

''یہ پارسائی ۔۔۔۔یہ تصوف ۔۔۔۔۔نیکی اور بدی کے درمیان کھنچی ہوئی فطری حدوں کا ذہنی ادراک یہ سب کس کام کا ہے ۔۔۔۔تو نے تخلیق سے قبل ایک لحظہ کے لئے سوچا تو ہوتا کہ ماحول جب اجنبی بن جاتا ہے تو انسان احساسات کی کن کن بھٹیوں میں جلتا ہے ۔یہ خواب جو میں دیکھ رہی ہوں ۔ناگزیر حقیقت سے یہ فرار جو میں چاہ رہی ہوں ۔کیا میں اس میں کبھی کامیاب ہوسکوں گی؟ کامیابی کیسی؟''

وہ ایک بار پھر سسک اٹھی ۔رندھے ہوئے گلے سے خود سے مخاطب ہوئی ۔

''بھٹکے بھٹکے خواب بھی کبھی تعبیر سے آشنا ہوئے ہیں؟۔۔۔۔۔۔لیکن مجھے تجھ سے گلہ ہے.......گلہ ہے........شکوہ ہے۔''

وہ چہرے کو ہتھیلی پر ٹکائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی ۔

''معبود ! مجھے تجھ سے گلہ ہے تو نے اگر تاریکیوں کو مقدر بنایا تھا تو روح میں قندیلیں کیوں روشن کیں؟ دیکھ تو سہی ۔کتنی گھمبیر تاریکی ہے یہاں۔۔۔۔۔۔گناہ کی مہیب چادر نے اس ماحول کو کس طرح ڈھانپا ہوا ہے ۔دم گھٹ رہا ہے میرا ۔''

وہ قمیض کے گلے کو مسل رہی تھی ۔سر دیوار سے ٹکا ہوا تھا ۔اور پاگلوں کی طرح خود سے بولتی جا رہی تھی ۔

''تو روشنیوں کی دنیا میں رہتا ہے ۔لیکن تجھے احساس نہیں کہ میری دنیا میں تیری روشنی کی، تیرے نور کی ایک کرن بھی نہیں ٹمٹماتی ۔تو ذہنی بصارت سے محروم کر دیتا تو مجھے گلہ نہ تھا ۔لیکن آنکھیں رکھتے ہوئے روشنی کی تمنا کون نہیں کرتا؟......میں نے آنکھوں کی تمنا تو نہ کی تھی ۔میں نے ایسے سوچنے، سمجھنے والے ذہن کی خواہش تو نہ کی تھی ۔''

کمرے کی دیواریں سرکتی محسوس ہو رہی تھیں ۔

میرا دم گھٹ جائے ۔۔۔۔۔۔گھٹ جائے گا'' یہ کہتے ہوئے وہ تیورا کر قالین پر گر گئی ۔

باب نمبر:۲

وہ اپنے وقت کی ایک نامی طوائف تھی۔جس کے حسن میں تڑپتی بجلیاں تھیں۔جس کی کافرانہ اداؤں میں طلسماتی سحر تھا۔غزالی آنکھوں کی پلکیں اٹھا کر جسے دیکھ لیتی۔اس کا دل دھڑکنا بھول جاتا۔حشر انگیز چال چلتی تو لوگوں کو اپنے دلوں پر قیامت گزرتی محسوس ہوتی۔شعلے کی طرح کمرے میں داخل ہوتی اور کوندے بن بن کر تماشائیوں کے ضبط کا امتحان لیتی۔وہ ایک فتنہ تھی جس نے سینکڑوں گھروں میں آگ لگا رکھی تھی۔

اس کے مداح روٗسا اور نواب تھے۔جو بھری جیبوں سے اس کے کوٹھے پر قدم رکھتے اور تہی دامن ہو کر اٹھتے۔

اس کی دولت،شہرت اور شباب کا سورج نصف النہار پر تھا۔جوانی کے ساغر سے جام بھر بھر کے لنڈھائے جا رہے تھے کہ شباب کے عین عروج میں اسے احساس ہوا کہ اس کے اندر ایک وجود تخلیق پا رہا ہے۔یہ سوچتے ہوئے کہ جانشین کے بغیر طوائف کا مستقبل تاریک ہوتا ہے اس نے اس نئے وجود کو اپنے لئے قدرت کا ایک گراں بہا عطیہ سمجھا۔

سہارے کی اسے بھی ضرورت تھی تا کہ جب شباب کا چمکتا سورج ڈھل جائے ۔اور بڑھاپا شام کی مانند اس کے دامن سے آچمٹے ۔تو کسی وارث کی صورت میں زندگی کے بقیہ ایام محفوظ ہوں ۔اپنی ماں اور نانی کی زندہ مثال اس کے سامنے تھی ۔ان کے لئے کیسا مضبوط سہارا ثابت ہوئی تھی ۔گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں میں زندگی کے چند دن ہی گزارنے نصیب ہوئے تھے ۔جسے انہوں نے محنت شاقہ سے پروان چڑھایا تھا۔

چند ماہ بعد جب اس کے ہاں ایک خوبصورت بچی نے جنم لیا تو خوشی سے اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے ۔اس کی خالہ زاد بہن سرلا بائی بھی خوش تھی ۔

بچی کی پرورش شاہانہ ٹھاٹ سے ہونے لگی ۔تربیت کی زیادہ تر ذمہ داری سرلا بائی کے سر تھی ۔لڑکی کی صورت میں غیر معمولی کشش تھی ۔اور چہرے پر معصومیت کا ایک ایسا دلفریب ہالہ سا تھا۔جو دیکھنے والوں کو اُلجھن میں ڈال دیتا۔عادات واطوار بچپن سے ہی طوائفوں کے بچوں سے مختلف تھے ۔

ممتاز بائی کے مداحوں اور پرستاروں نے اسے مشورہ دیا کہ بچی کو انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم دلواؤ ۔زمانے کی اقدار بدل رہی ہیں ۔نئے زمانے کے نئے تقاضوں سے واقفیت ہو تو شکار پھانسنے میں آسانی رہے گی ۔

چنانچہ اس کے لئے ایک بہترین ٹیوٹر کی خدمات معقول معاوضے پر حاصل کی گئیں ۔ٹیوٹر بچی کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر حیران رہ گیا ۔وہ کسی طور بھی طوائف کی بیٹی معلوم نہ ہوتی تھی ۔اگر شکل میں ماں سے حد درجہ مماثلت نہ ہوتی تو وہ یہی سمجھتا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے ۔

چند مہینوں تک وہ اس کے الٹے سیدھے سوالات کے جواب سے گریز کرتا رہا۔لیکن اس کی غیر معمولی ذہانت ہر روز ایک نئی بات ایک نیا نکتہ پیدا کر دیتی ۔اُس نیک

دل آدمی نے سوچا کہ یہ اُس کی آزمائش کا ایک کڑا وقت ہے۔ایک طرف اگر روزی ہے تو دوسری طرف ایک معصوم فطرت بچی، جو اپنے ماحول سے باغی نظر آتی ہے۔

تب اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ روزی کو فرض پر قربان کردے گا۔چپکے چپکے فطرت کے اسرار و رموز اس پر کھلنے لگے۔ذہن کو جلا ملتی گئی۔اور اپنے ماحول سے اس کا تنفر بڑھتا گیا۔ایمان کی جو شمع استاد نے روشن کی تھی۔اس کی روشنی سے شاگرد کا سینہ منور ہوتا گیا۔

اور نتیجتاً اس نے محفلوں میں شرکت کرنے سے پہلوتہی شروع کردی۔گھاگ ماں تو اسے ابھی سے لوٹنے کے تمام ہتھکنڈوں سے لیس کرنا چاہتی تھی۔اس کے طور طریقے دیکھ کر وہ چونکی۔

ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ شروع ہوا۔لیکن جب کوئی حربہ کارگر نہ ہوا تو ٹیوٹر کی سخت بے عزتی کرنے کے بعد اُسے ہٹادیا گیا۔اور رغونہ کو رقص وموسیقی کے لئے گھسیٹا جانے لگا۔

لیکن اس کی پاکیزہ فطرت کسی طور پر آمادہ نہ تھی۔وہ محفلوں میں بیٹھتی تو گم صم ہوکر۔اسے بلانے کا ہر جتن ناکام ہوجاتا۔استادلوگ ساز سکھاتے تو عجیب وغریب سرنکالتی۔زیادہ غصہ آجاتا تو ساز پٹخ دیتی اور خود وہاں سے چلی جاتی۔اس کی ہر حرکت ناقابل فہم بنتی جارہی تھی۔

وہ جوان ہورہی تھی۔اس کے نرم اور دلفریب وجود میں صبا کے خوش گوار جھونکوں کی سی فرحت اور آسودگی تھی۔

وہ اپنے حسن، تصنع، بناوٹ اور جوانی کے نازنخروں سے بے نیاز تھی۔اور یہی چیز ممتاز بائی کو برانگیختہ کئے جارہی تھی۔

اس کے حسین سراپا پر نظر پڑتے ہی ممتاز بائی کے دل پر آرے سے چلنے لگتے۔

''سرلا بائی!''۔۔۔۔وہ رندھی ہوئی آواز میں کہتی۔

”وہ شعلہ بن گئی ہے۔اس کے وجود میں قیامتیں سمٹ آئی ہیں۔لیکن یہ قیامت
کسی پرنہیں ٹوٹتی یہ شعلے کسی کو نہیں جلاتے یہ .....کس گناہ کی سزا ہے؟“

باب نمبر:۳

قیمتی زرتار ساڑھی پاؤں میں اُلجھ اُلجھ پڑ رہی تھی ۔لمحہ بھر کو وہ رکتی ۔داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے اسے قدرے اوپر اٹھاتی اور پھر چھوڑ دیتی.فکر کسی گہری بدلی کی مانند اس کے چہرے پر چھایا تھا۔وہ آنکھیں جنہیں دیکھ کر یہ احساس ہوتا کہ کائنات کا سارا حسن ان میں سمٹ گیا ہو۔آج بوجھل بوجھل اور بجھی بجھی سی تھیں ۔

آج ان میں شرارے نہ تھے۔

اداسی کا گہرا کہر حسن کو ماند کر رہا تھا۔

سرلابائی کمرے میں آئی ۔

نگاہوں کا تصادم ہوا۔

ساڑھی کو کمر پر لپیٹتے ہوئے وہ قالین پر بیٹھ گئی ۔گاؤ تکیے پر جسم کا داہنا حصہ گراتے ہوئے اس نے سرلابائی کی آنکھوں میں جھانکا۔

وہاں طویل خاموشی تھی ۔

سناٹا تھا۔

اضطراب میں تیزی آگئی۔

اس کے گھٹنوں کو ہاتھوں سے مسلتے ہوئے وہ دردناک لہجے میں بولی۔

''سرلا غلاظت کے اس ڈھیر میں یہ خوشبودار پھول کیسے؟''

سرلا بائی خاموش تھی مگر ٹکر ٹکر اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

''کچھ تو بولو۔ کچھ تو کہو۔''

''تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟ کیوں یہ الٹی سیدھی باتیں سوچتی ہو؟ یہ اسرار قدرت ہیں۔ جنہیں ہماری ناقص عقل نہیں سمجھ سکتی۔ لیکن ہم اسے بدل سکتے ہیں ماحول کے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔''

ان اسرار قدرت کی یہاں کیا ضرورت تھی؟ پاکیزہ معاشرے کی بستیاں کیا اس کام کے لئے کم تھیں۔۔۔۔۔ سرلا ! میں پوچھتی ہوں۔ اسے ہمارا ٹھکانہ ہی نظر آیا اپنے اسرار کے ظہور کے لئے۔۔۔۔

''پاگل ہوگئی ہو۔ کیا واہی تباہی بک رہی ہو؟ یہ کفر کے کلمات ہیں ممتاز یوں مت کہو۔'' سرلا بائی کی آواز میں خوف کا ہلکا ہلکا عنصر تھا۔

''میں یوں ہی واہی تباہی بکوں گی۔ میں یونہی اسے کوسوں گی۔ وہ نہیں جانتا کہ ہم نیکی کو سینے سے لگائیں گے تو بھوکے مر جائیں گے۔ اسے نہیں معلوم کہ ہمیں زندہ رہنے کے لئے کھانا چاہیئے۔ پہننے کے لئے کپڑا چاہیے۔ ہم پرہیزگاری کے راستے پر چلیں گے تو کوئی تھوکے گا بھی نہیں۔''

''خدا کے لئے کچھ ہوش کرو۔ کیوں دماغ چل گیا؟'' اس نے سرزنش کی۔

''دماغ چلے گا نہیں تو اور کیا ہوگا۔''

ممتاز بائی نے سر دیوار سے ٹکا لیا۔اس کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں ۔آواز کا سارا جوش وخروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا ۔دل کا سارا درد لہجے میں امنڈ آیا۔

''سرلا!تم تو جانتی ہو.....تم سے کیا پوشیدہ ہے؟اس سے بھی نہیں پوشیدہ ...جو آسمانوں میں رہتا ہے کہ اب شباب رخصت ہو رہا ہے۔پھول مرجھا رہے ہیں ۔بہار رنگینیاں سمیٹ رہی ہے ۔خزاں دبے پاؤں چلی آرہی ہے۔

اور سرلا۔

خزاں آجائے گی تو جانتی ہو! یہ محفلیں ! یہ رونقیں ، یہ عشرت کے سامان .....سب ختم ہوجائیں گے۔''

''ہم اپنی ساکھ کھو بیٹھیں گے.....ہماری شہرت کو گہن لگ جائے گا۔

سرلا! گہن .....!''

اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ڈوبتی آواز میں جوش پیدا ہوگیا تھا۔اور وہ اپنے اصلی روپ میں لوٹ آئی تھی۔وہ چلا رہی تھی۔

''یہ پیسے پیسے پر مرنے والیاں، جو میری ہمسری کا دعوی کرتی ہیں۔جو میرے حسن سے جلتی ہیں۔لوگوں کو میرے خلاف بھڑکاتی ہیں۔

سرلا! میں ان سے شکست کھا جاؤں گی----پٹ جاؤں گی۔میرے دشمن گھی کے چراغ جلائیں گے----بازار میں شادیانے بجیں گے۔لوگ کہیں گے کہ حسن کی رانی کا آفتاب غروب ہوگیا۔تم بولو سرلا! کیا یہ ایک المیہ نہ ہوگا؟میں نے یہاں حکومت کی ہے۔میں نے یہاں اپنے نام کا سکہ چلایا۔اور اب میں بے بسی اور کسمپرسی کی زندگی اپنا لوں؟

ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیے۔

سرلا ایسا کبھی نہیں ہوگا۔۔۔۔۔

ممتاز بائی مر جائے گی۔۔۔۔۔!

اس کو سمجھاؤ کہ اس کے دم سے میری کتنی حسین توقعات وابستہ ہیں؟ میں نے اس کے دم سے کتنے تاج محل تعمیر کرر کھے ہیں۔ کیا وہ میری امیدوں کو توڑ دے گی؟ کیا وہ میرے خوابوں کو ملیا میٹ کر دے گی؟ کیا وہ میری توقعات کے پر نچے اڑا دے گی؟ اگر وہ ایسا کرے گی تو اس سے کہہ دو کہ میں اسے کتوں سے نچوا دوں گی۔ وہ میری اولاد ہے تو کیا؟ میں نے اسے جنم دیا تو کیا میں اپنی عزت کے لئے سب کچھ کر سکتی ہوں۔''

سرلا بائی اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی اس کے کتنے روپ تھے۔ اور ہر روپ دوسرے روپ سے کتنا مختلف تھا؟ سرلا بائی خود طوائف ہوتے ہوئے بھی حیران تھی۔ وہ شریں گفتار اور شاعرانہ گفتگو کے لئے اگر دور دور تک مشہور تھی تو فحش کلامی میں بھی اس کا جواب نہ تھا۔ ایسی ایسی گالیاں دیتی کہ کانوں پر ہاتھ دھرنے پڑتے۔

''صبر سے کام لو ممتاز! مجھے امید ہے کہ ہم اسے آہستہ آہستہ حالات کے سانچے میں ڈھال لیں گے۔ تمہیں اپنی صلاحیتوں پر بھر پور اعتماد ہونا چاہیے۔ تم نے بڑے بڑوں کو اپنے قدموں میں جھکالیا۔ وہ تو تمہاری کوکھ سے نکلی ہوئی زرغونہ ہے۔''

''سرلا میں نے اس کی تربیت کی کلی ذمہ داری تم پر ڈال دی تھی۔ تم مجھے اب جھوٹی تسلیوں سے بہلا رہی ہو۔ خوش فہمیوں میں مبتلا کر رہی ہو۔ حقیقت کا جو چہرہ مجھے نظر آ رہا ہے۔ اس پر اب بھی پردہ ڈال رہی ہو۔ تم نہیں جانتیں وہ چودہ سال کی ہو رہی ہے۔ لیکن وہ اس ماحول سے متنفر ہے۔ موسیقی سے اسے کوئی رغبت نہیں۔ رقص سے بھاگتی ہے۔ محفل میں جبراً گھسیٹ کر بٹھایا جاتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے ایک من برف کا تودہ لا کر رکھ دیا ہو۔ اتنی بے حسی اور سرد مہری۔ کوئی اس کے حسن کی تعریف کرتا ہے تو اس کی پیشانی پر ستر ہزار شکنیں

پڑتی ہیں ۔کوئی اسے کچھ کہتا ہے تو اس کی آنکھیں اور چہرہ غصے سے سرخ ہو جاتا ہے ۔یہ سب کچھ کب تک چلے گا؟۔۔۔۔۔۔

کچھ سوچو سرلا !ہمیں اب اس کی نتھ اتروانے کی فکر کرنا چاہیے ۔''

''نہیں ممتاز!ابھی وہ چودہ سال کی نہیں ہوئی ۔وہ بہت کم عمر ہے ۔''

''سرلا کیوں بے جا حمایت سے اس کا دماغ خراب کر رہی ہو ۔بغاوت کرنے میں اس نے کوئی کسر باقی تو نہیں چھوڑی ۔وہ مقابلے پر آ گئی ہے یہ الگ بات ہے کہ میں ہی ابھی تک تحمل سے کام لے رہی ہوں ۔''

''کیا خیال ہے تمہارا کسے چننا چاہتی ہو؟''

اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا ۔

''انتخاب کا مسئلہ میرے لئے بڑا ٹیڑھا ہے ۔سیٹھ قاسم اس دن آیا تھا وہ بات کر گیا ہے سیٹھ عبدل نے بھی خواہش ظاہر کی ہے ۔لینڈ لارڈ فریدی الگ مرا جا رہا ہے؟سرلا!کوئی ایک ہو تو کہوں ،کئی ہیں جو اس کی بھاری سے بھاری قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہیں ۔لیکن ابھی میں اس کے رویے کو دیکھتے ہوئے خود ہی تذبذب کا شکار ہو رہی ہوں ۔سوچتی ہوں ۔وہ ٹھیک ہو جائے تو اچھا ہے ۔''

اس نے پریشان آواز میں اسے تفصیل بتائی ۔

''لیکن ممتاز جاناں کہہ رہی تھی کہ فریدی کی مالی حالت نہایت پتلی ہو رہی ہے ۔''

''اس کو کیسے پتہ چلا ۔ڈورے ڈالنا چاہتی ہے اس پر ۔۔۔۔۔میں جانتی ہوں ۔بہر حال اگر ایسا بھی ہو تو ہماری بلا سے ۔ہمیں اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہے وہ مل رہا ہے ۔''اس نے موٹی موٹی گالیاں نکالتے ہوئے بات ختم کی ۔لیکن غصہ شاید ابھی باقی تھا پھر بولی ۔

''ارے فریدی! اس میں اتنی استطاعت ہے کہ وہ کتنوں کو خرید لے۔
میں بھی حیران تھی۔پھر سوچا تم سے بات کروں گی۔جاناں نے تم سے کہا تھا؟''
اس نے سوال کیا۔

''مجھ سے کہاں؟ لیلیٰ سے بات کر رہی تھی۔لیلیٰ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔جانتی تھی کہ فریدی ہمارا گاہک ہے میں نے پرزور تردید کی۔''

''جلتی ہیں۔انگاروں پر لوٹتی ہیں پر کیا کریں۔بس نہیں چلتا سرلا میں زرغونہ کے بارے میں کیوں اتنی متفکر ہوں؟صرف یہی وجہ ہے میں انہیں جلا جلا کر تڑپانا چاہتی ہوں۔اور ہمیں اس سلسلے میں تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔''
اس نے رائے پیش کی۔

''جیسے تمہاری مرضی۔مجھے کوئی اعتراض نہیں۔بس ذرا اس کی عمر کا خیال تھا۔''

''میں اس کی ایک جھلک نواب داؤد کو دکھا کر ردعمل دیکھنا چاہتی ہوں وہ جدی پشتی نواب ہے اور ہیروں کو خوب پہچانتا ہے۔

''ممتاز! میری خواہش ہے یہ تقریب شاندار طریقے سے منائی جائے۔''
سرلا بائی نے خواہش ظاہر کی۔

''فکر نہ کرو سرلا! یہ رسم اتنی دھوم سے منائی جائے گی کہ کوٹھوں کی تاریخ میں صدیوں تک یاد رکھی جائے۔میں روپیہ پانی کی طرح بہاؤں گی لیکن تقریب کی شان وشوکت میں کمی نہ آنے دوں گی۔''

''ایسی ہی ہونا چاہیئے آخر وہ ہماری بیٹی ہے اور ہمارے دم سے بازارِ حسن کی شان قائم ہے۔اپنے وقت میں تمہارا ڈنکا بجا اور اب بھی بج رہا ہے۔اب زرغونہ نئی شان سے جلوہ گر ہوگی۔''

سرلا بائی کے گلے کی رگیں فخر سے پھول رہی تھیں ۔

''لیکن سرلا میرا دل کبھی کبھی دہل اٹھتا ہے۔خوف کے انجانے سے سائے میرے ذہن پر چھانے لگتے ہیں ۔زرغونہ سے مجھے ڈر لگتا ہے جوتو قعات اور امیدیں ہم اس سے وابستہ کر رہے ہیں کہیں وہ ان کا گلہ ہی نہ گھونٹ ڈالے۔''اس کی کڑکتی ہوئی آواز خوف سے کپکپارہی تھی۔''

''یوں فضول فکر میں گھلنے کی ضرورت نہیں سب کام ٹھیک ہوں گے۔کچھ ہماری بھی غلطی ہے۔اول دن ہی سے سختی کرتے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی بہر حال !قبل از وقت واویلا فضول ہے۔ویسے ممتاز !تمھیں کچھ یاد ہے اس کا باپ کون ہے۔''سرلا نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔''

''چھوڑو میں اُسے یاد نہیں کرنا چاہتی۔اُسی کا بیج ہے جس نے مجھے ایک نظر میں فتح کر لیا تھا اور خود جسے فتح کرنے میں میں نے ایڑیاں رگڑی تھیں۔پر میری تو سمجھ میں نہیں آتا طوائف کا دودھ پیا اور گناہ کے ماحول میں پروان چڑھی لیکن پھر بھی نیکی اور بدی میں الجھی ہوئی ہے۔۔۔۔کبھی کبھی تو مجھے اپنے دودھ کی تاثیر ہی بے اثر نظر آتی ہے۔''

''چھوڑو۔ان فلسفیانہ گتھیوں میں مت الجھو۔ذہن کو مت الجھاؤ۔تمہارے لئے خوش و خرم رہنا بہت ضروری ہے۔سب کام ٹھیک ہو جائیں گے۔''

سرلا نے تسلی دی اور اٹھ کھڑی ہوئی ۔

''سرلا ! کچھ لوگ میرے انتظار میں ہوں گے۔ان سے کہہ دینا میری طبیعت ٹھیک نہیں۔میں آرام کرنا چاہتی ہوں ۔سر درد سے پھٹ رہا ہے۔اور ذہن اڑتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔''

ممتاز بائی پلنگ پر دراز ہوتے ہوئے بولی ۔

"ٹھیک ہے آرام کرو۔"
یہ کہتے ہوئے سرلا کمرے سے نکل گئی۔

باب نمبر:۴

سازندوں کی مشتاق انگلیاں مشینی انداز میں رکیں ۔اپنے عروج پر پہنچا ہوا ساز پل بھر میں دم توڑ گیا۔اور تھرکتا ہوا خوبصورت وجود اپنی جگہ جام ہوگیا۔کھنکتی فضا جس میں سازاور نغمہ کی دلفریب تانیں اڑ رہی تھیں۔پرسکون ہوگئیں۔

چھلکتے ارغونی جام ہاتھوں میں پکڑے کے پکڑے رہ گئے۔فضا پر خامشی کا لطیف ساسحر طاری ہوگیا۔نشے سے بوجھل نشیلی آنکھیں رقاصہ پر جم گئیں اور ماحول کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں دیکھتے ہوئے سازندوں نے رکا ہوا ساز پھر چھیڑ دیا۔

رقاصہ نے انداز دلبری سے سر جھٹکا اور حسین جسم بجلیاں گرانے لگا۔

رقص کا یہ حسین انداز تماشائیوں کو تڑپا گیا۔

”تیرا جواب نہیں ظالم“ کتنے ہونٹوں سے نکلا۔

گاؤ تکیے کے سہارے ہاتھ میں جام پکڑے نواب داؤد بھی مسکرا کر رہ گئے۔مصاحب کو اشارہ کیا اور روپوں کا بارانی موسم شروع ہوگیا۔رقص ختم ہوگیا۔۔۔فضا

تالیوں سے گونج اٹھی۔

رقاصہ ناز سے اٹھلاتی ہوئی نواب داؤد کی طرف بڑھی اور کورنش بجالائی۔

''تم اور تمہارا فن لاجواب ہے ممتاز بائی۔''نواب داؤد نشے میں جھومتے ہوئے بولے۔

''بندی عزت افزائی کے لئے ممنون ہے۔''ممتاز بائی نے مودبانہ انداز میں سر جھکا دیا۔

''ہم تمہارے رقص سے بہت محظوظ ہوئے۔یہ تمہارا انعام ہے۔''نواب صاحب نے اشرفیوں کی تھیلی اس کی طرف بڑھائی۔

''ناچیز کے پاس شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں۔''ممتاز بائی پھر کورنش بجا لائی۔

''ممتاز بائی شکریہ کی ضرورت بھی نہیں۔تمہارا لازوال حسن تو متقاضی ہے کہ ہر چیز اس پر لٹادی جائے۔''

ہوس ناک نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''عنایت ہے عالی جاہ!حسن نظر ہے،

وگرنہ من آنم کہ من دانم''

شہد میں ڈوبے الفاظ ممتاز بائی کے یاقوتی لبوں سے نکل رہے تھے۔

''حضور اگر اجازت ہو تو بندی کچھ عرض کرنا چاہتی ہے۔''

'' تکلفات کے یہ پردے ہٹا دو ممتاز بائی۔۔۔۔جو کہنا چاہتی ہو بلا جھجک کہو۔''

''میں خدمت عالیہ میں بہار کا رنگین و حسین پھول پیش کرنا چاہتی ہوں در نایاب

کا دیدار کروانا چاہتی ہوں ۔اجازت کی طالب ہوں ۔"مسکراتے ہوئے نواب داؤد نے اثبات میں سر ہلایا۔

کچھ لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ لوگوں نے دلکشی و رعنائی کے ایک دل آویز پیکر کو سٹیج کی طرف بڑھتے دیکھا۔حسین سراپا،چال میں وقار اور چہرے پر اداسی لئے تمکنت سے آگے بڑھ رہا تھا۔

لوگوں نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔اس کا ایک ایک نقش ممتاز بائی کا عکس تھا۔لیکن اس کے انداز پیشہ ور عورتوں سے بالکل مختلف تھے۔یوں لگتا تھا جیسے کسی معصوم لڑکی کو اس منزل کا راہرو زبردستی بنا دیا گیا ہو۔

جام ہاتھوں میں تھے اور لوگ جرعے لینے بھول چکے تھے۔

ساز کو گود میں رکھتے ہوئے اس نے ایک پل کے لئے نگاہیں اٹھائیں۔

اس کی آنکھوں میں اداس سنگیت جنم لے رہے تھے۔پلکوں کے کناروں پر دیئے جھملا رہے تھے ۔مخروطی انگلیوں نے ساز اور مترنم آواز نے روح کے تاروں کو چھیڑ دیا۔انسانی آواز یا ایک جادو۔

تماشائی ساکت تھے۔دم بخود تھے۔

اور وہ ساحر لدھیانوی کی غزل گا رہی تھی۔

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنا کے سہارے جی لیا میں نے
انہیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے

کہ کچھ مدت حسین خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے
بس اب تو دامن دل چھوڑ دو بے کار امیدو !
بہت دکھ سہ لئے میں نے بہت دن جی لیا میں نے !

غزل کیا تھی ۔درد سوز میں ڈوبا ہوا ایک نشتر تھا جو لوگوں کے سینوں میں گھنپا چلا جا رہا تھا۔نغمہ کب ختم ہوا اور مغنیہ کب گئی کسی کو کچھ ہوش نہ تھا۔

خاموشی کا سحر ٹوٹا تو لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے چین ہو گئے۔محفل اس کے حسن اور آواز کے سحر سے مسحور ہو چکی تھی۔

ممتاز بائی کی نگاہیں نواب داؤد کے چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیات کا عمیق جائزہ لے رہی تھیں۔

''تیر جو چلا تھا نشانے پر بیٹھا تھا۔''

فسوں خیز حسن کا سحر ٹوٹا اور نواب داؤد کو قدرے ہوش آیا تو ممتاز بائی کو بلایا گیا۔

''ممتاز بائی !''

اس کے ہونٹ یہی الفاظ ادا کر سکے۔

لیکن وہ عندیہ سمجھ چکی تھی ۔اس کی نگاہوں کا مفہوم پڑھ چکی تھی ۔مطلب بڑا صاف اور واضح تھا۔

وہ موسم بہار کے اس رنگین پھول کے متعلق جاننے کا آرزومند تھا۔''وہ عالی جاہ یہ زرغونہ ہے،میری دختر۔''

''زرغونہ !''

اس نے حسرت سے کہتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری''ہمارا خیال غلط نہ تھا۔تم

مجسم قیامت ہو اور تمہاری بیٹی کیا کہوں !ممتاز بائی ۔!''

لمبی سانس لیتے ہوئے نواب صاحب نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد گویا ہوا۔

''ہم تم سے تخلیے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔''

دل کے اندر مچلتی خواہش تخلیہ پاتے ہی ہونٹوں پر آ گئی۔

''حضور سوچنے کی مہلت دیں زرغونہ ابھی کم عمر ہے۔''

''ممتاز بائی! ہم نے اپنی خواہش ظاہر کر دی ہے۔اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس کی تکمیل جلد از جلد ہو۔''

''عالی جاہ! مجھے کچھ غور کرنے کی بھی....''

''ممتاز بائی''۔۔۔۔نواب صاحب نے فقرہ کاٹ دیا۔

''تمہاری بیٹی صبح کی اس شگفتہ کلی کی مانند ہے جس کے دامن میں شبنم کے ٹھنڈے ٹھنڈے قطرے سمٹے ہوتے ہیں۔اس کے چہرے پر پاکیزگی کی وہ چمک ہے۔جس سے تمہارے چہرے محروم ہیں۔اس سے پیشتر کہ شبنم کے قطرے اپنی لطافت اور خوبصورتی کھو بیٹھیں۔کلی کی بھینی بھینی خوشبو ہوا میں تحلیل ہو جائے۔ہم اسے شاخ سے توڑ کر اپنے دامن میں سجالینا چاہتے ہیں۔ہم تمہارا ہر مطالبہ پورا کریں گے۔''

انداز فیصلہ کن تھا۔

''بہتر !حکم سے سرتابی کی مجال نہیں۔''ممتاز بائی نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

''ہم بہت جلد تمہارے دولت کدے پر شان و شوکت اور جاہ و جلال سے حاضر ہوں گے۔زرغونہ کے قرب کے لئے ہم بے چین ہو گئے ہیں۔''

''اب اجازت چاہتے ہیں۔''انہوں نے اٹھتے ہوئے مخمور آنکھوں سے دیکھا۔

''جیسا مزاج عالی چاہے۔''

ممتاز بائی کے قدم زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔آنکھوں میں ڈھیروں دولت پانے کی چمک اور من مانی مراد کے بر آنے کی خوشی رگ و پے میں شراب کا تیز نشہ بن کر دوڑ رہی تھی۔

زر کی چمکیلی تاروں سے بنے ہوئے جھولے میں جھولتی جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو سرلا بائی سامان کی پیکنگ میں مصروف تھی۔

زرغونہ کمرے میں نہیں تھی۔

''سرلا ! شکار گھائل ہو کر تڑپ رہا ہے۔''اس کے لبوں پر عیارانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''گھائل نہ ہوتا۔دیکھا کسے تھا؟ بہر حال کیا بات طے ہوئی ؟ سرلا کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

بات کیا طے ہوتی ہے میں نے آتش شوق پر خوب خوب تیل چھڑ کا نوعمری کا کہا۔ جب دیکھا کہ اب آگ خوب بھڑک رہی ہے۔تب دوسرے شائقین کا بھی حوالہ دے دیا۔جل ہی تو اٹھا۔''

ممتاز بائی نے کمر لچکاتے اور آنکھیں مٹکاتے ہوئے اسے بتایا۔

''تو گویا کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔''

''لو ! سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ارے میں نے تو اسے ہیرا دکھایا ہے ہیرا۔آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔سرلا تو کیا سمجھتی ہے؟''

وہ پھولے سانس سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔

''پتہ ہے کیا کہتا تھا؟''۔۔۔۔اس نے حقارت سے سرلا کو دیکھا۔

''کیا؟''سرلا نے تجسس سے پوچھا۔

''تمہاری بیٹی کے چہرے پر وہ چمک ہے جس سے تمہارے چہرے محروم ہیں۔۔۔۔کوئی اس سے پوچھے کہ ہمارے چہروں سے یہ پاکیزگی کس نے نوچی، کس نے ہمیں اس حال تک پہنچایا۔کس نے ہمیں کاٹ کرا لگ کر پھینک دیا۔تم حسین صورتوں والوں نے تم پاکیزہ چہرے والوں نے جنہیں اپنے عیش کے لئے اڈے درکار تھے۔آج ہمارے ہی منہ پر ہماری ہی جوتیاں مارتے ہو۔دیکھنا ذرا کیسے درست کرتی ہوں؟بڑے آئے پاک صورتوں والے۔۔۔۔۔وہ زہر اگل رہی تھی۔

''زرغونہ کہاں ہے؟اس نے کمرے میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں ہوگی۔''۔۔۔۔۔سرلا نے جواب دیا۔

''سرلا !میں نے آج تک زندگی میں شکست تسلیم نہیں کی۔لیکن اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنا انجام عبرت ناک نظر آرہا ہے۔تم نے اسے دیکھا ہے۔رات کا کھانا نہیں کھایا۔صبح ناشتے سے انکار کر دیا۔''

''ناشتہ تو اس نے کیا ہے۔''۔۔۔۔سرلا نے کہا۔

''میرے جانے کے بعد کیا ہوگا۔۔۔۔۔سرلا میں زرغونہ سے خائف ہوں۔''

مبہم مبہم اندیشے آنکھوں کے گوشوں سے باہر لپک رہے تھے۔

چند لمحوں تک سرلا بائی بھی سوچ میں ڈوبی رہی۔اور پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم یونہی ہر چیز کو زیادہ محسوس کرتی ہو۔یہ درست ہے کہ اس کا ذہن ہمارے طرز فکر کو پسند نہیں کرتا۔لیکن ہم کیا اس کی پسند دیکھیں گے اگر وہ اس زندگی کو اپنانے کے لئے بخوشی تیار نہ ہوگی تو اسے جبراً اس میدان میں گھسیٹ لیا جائے گا۔کیوں گھبراتی ہو؟وہ رقص

بھی کرتی لیکن تم ہی نے کچھ سوچ کر منع کر دیا میں نے بھی تمہارے خیال سے اتفاق کیا۔"

''میں تو ڈر رہی تھی کہ کہیں ناچنے کی بجائے کچھ اور نہ کرنا شروع کر دے۔اسی لئے منع کر دیا تھا۔لیکن ویسے خیر اس نے گانا اچھا گایا ہے۔"

''ممتاز ان خیالات کو دماغ سے نکال دو۔اس طرز زندگی کو اپنانے میں ہی اس کی عافیت ہے اور وہ اپنائے گی۔جانا کہاں ہے اس نے؟''

باب نمبر:۵

وہ ایک گھر کا رہائشی کمرہ نہیں ۔زیوارت کا شو روم معلوم ہو رہا تھا۔جھلملاتے جگمگاتے اورنسوانی قلوب میں ہلچل مچاتے ہیرے جواہرات ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلے ہوئے تھے ۔ایک مقناطیسی کشش نے پورے کمرے کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔آنکھیں جس طرف اٹھتیں اٹھی رہ جاتیں ۔جہاں جمتیں جمی رہ جاتیں۔زیوارت کےان نادر نمونوں کو دیکھ کر آنکھوں میں کہیں حسرت، کہیں جلن اور کہیں رقابت کے جذبے موجیں مار رہے تھے۔

فاتحانہ شان سے ساڑھی سنبھالتی ممتاز بائی کمرے میں داخل ہوئی ۔ایک نظر سب پر ڈالی ۔حقارت وغرور کا ایک ایسا احساس اس نظر نے دیکھنے والوں کی آنکھوں میں منتقل کیا کہ ان کے سینوں پر سانپ لوٹ گئے ۔لیکن ظاہرداری کے لئے اپنے جذبات چھپانے پڑے۔چہروں پر پھیلتے رقابت کے رنگوں پر مسکراہٹ کا پردہ چڑھانا پڑا۔ہنسی ہونٹوں پر جبراً لانی پڑی۔

''پسند آئے آپ کو زیوارت؟ پیرس سے منگوائے گئے ہیں۔گردن کو اکڑاتے ہوئے اس نے فخر سے کہا۔

''پہننے والی بھی تو اسی قابل ہے۔چار چاند لگ جائیں گے۔''نائکہ خوشامدانہ انداز میں بولی۔

''اس میں کچھ تمہارے بھی ہیں۔''نازو نے پوچھا۔

ممتاز بائی کے بعد بازار میں اسی کی مانگ زیادہ تھی۔کافی حسین عورت تھی۔اور دونوں کے درمیان پیشہ وارنہ رقابت بھی چلتی تھی۔

''یہ سب نواب صاحب کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ہمارا اس میں کچھ نہیں۔''۔۔۔ممتاز بائی نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

''خوش قسمت ہو ممتاز۔دلی مبارک باد قبول کرو۔تم نے ہیرا چنا ہے ہیرا''اسی اُدھیڑ عورت نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔

''تم لوگوں نے عروسی لباس اور زیوارت نہیں دیکھے؟''اس نے استفسار کیا۔

چند ایک نے کہا دیکھا ہے اور چند ایک نے بتایا کہ یہاں سے جانے کے بعد دیکھیں گے۔

''ہم سب کی طرف سے مبارک باد قبول کرو ممتاز!''

یہ مینا کی آواز تھی۔تیس بتیس سال عمر ہوگی۔خوبصورت تھی اور اچھا کاروبار رکھتی تھی۔

''چائے تیار ہے۔''خادمہ نے کمرے میں آکر کہا۔

''جلدی کیجئے۔چائے پی لیں۔پھر کھانا بھی کھانا ہوگا۔''ممتاز بائی نے کہا۔

''سرلا! میرا خیال ہے۔سب لوگ دیکھ چکے ہیں۔کیوں نہ ڈبوں کو بند کردیا

جائے۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں ممتاز! ابھی اونچی حویلی والوں نے آنا ہے۔''

''وہ لوگ ابھی تک نہیں آئے؟'' اس نے حیرانی سے بہن کی طرف دیکھا۔

''بس آتی ہی ہوں گی۔''

''مجھے ڈر ہے سرلا ! زیوارت بہت قیمتی ہیں کوئی ادھر ادھر نہ ہو جائے۔'' ممتاز بائی نے کمرہ خالی ہونے پر اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''میں آخر کس مرض کی دوا ہوں؟ گھبراتی کیوں ہو؟ ایک ایک چیز پر میری نگاہ ہے۔''

''دیکھا سب کا ردعمل ۔۔۔۔۔۔ دانتوں میں انگلیاں لے لی ہیں۔ نازو کو دیکھنا تھا۔ ہمارا مقابلہ کرتی ہے ارے ممتاز بائی تو تجھ جیسی کو کھڑے کھڑے بیچ ڈالے۔ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''سرلا ! زرغونہ کہاں ہے اور وہ کیا کر رہی ہے؟'' میں تو اس افراتفری میں اسے ہی بھول بیٹھی ہوں۔ کیسا موڈ ہے اب اس کا؟''

''ٹھیک ہے۔ غسل کیا تھا اور اب میرا خیال ہے وہ سو رہی ہے۔ سر درد کی شکایت کر رہی تھی۔''

''اچھا ہے سو جائے۔'' اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

''سارے بازار کی دولت پر قبضہ کیے بیٹھی ہے۔ مرتی بھی تو نہیں۔''

سیڑھیاں اترتے اترتے نازو نے اپنی ساتھی سے سرگوشی میں دل کا زہر اگلا۔

''جادوگرنی ہے جادوگرنی! دیکھا تھا۔ کس حقارت سے سب کو دیکھ رہی تھی۔'' ریما بھی پھٹ پڑی۔

''مانا کہ خوبصورت ہے۔حسن میں یکتا ہے۔لیکن بازار میں حسن کی بھی کمی نہیں ۔پھر بھی جسے دیکھو اسی کے کوٹھے پر بھا گا چلا آرہا ہے۔''لیلیٰ نے پھپھولے پھوڑے۔

''ارے بھئی وہ خود حسین آ گے سے بیٹی چار چاند جیسی صورت والی ۔طنطنہ کیسے نہ ہو بھئی ۔حق ہے اُسے اترانے کا۔''رانجھن بولی تھی۔

''اب تمہارے منہ کون لگے؟بڑی آئیں اس کی چہیتی ۔جوتی نہیں مارتی تمہیں۔''نازو نے غیرت دلائی۔

''ہم کون سا کسی کو جوتی مارتے ہیں؟بلایا تھا آ گئے۔سچی بات کہہ دی تو تمہیں مرچیں کیوں لگ گئیں۔''

یہ کہتے ہوئے لیلیٰ آگے بڑھ گئی۔

''بڑی چکرباز عورت ہے۔گھما دیا ہے نواب داؤد کو۔''زینو نے مائی سے کہا۔

''ارے زینی وہ تو انسان ہے ۔یہ تو وہ عورت ہے جس نے موت کو بھی چکر دے دیا۔کوئی کہتا تھا پچھلے سال کہ بچ سکے گی؟''

''میں نے سچ بڑی دعائیں مانگی تھیں کہ مرے اور جان خلاصی ہو۔''

''وہ تو ہم سب کو مار کر مرے گی بہت ڈھیٹ عورت ہے ۔تم کیا سمجھتی ہو اسے،لیکن ایک بات ہے زینی!زرغونہ ماں پر نہیں۔بہت باتیں سنی ہیں میں نے اس کے متعلق۔''

ارے ہاں ٹھیک کہتی ہو۔ویسے وہ لڑکی کتنی معصوم صورت ہے۔سچ اس کی ماں سے تو ہمیشہ مجھے جلن رہی ہے لیکن لڑکی پر بہت پیار آتا ہے گم صم چپ چاپ رہتی ہے یوں جیسے منہ میں زبان نہ ہو۔۔۔۔۔''

باتیں کرتے کرتے وہ چائے کے کمرے تک پہنچ گئیں کمرے کی سجاوٹ میز پر

سلیقے سے سجی ہوئی مٹھائیاں امارت وشان کا دل کھول کر مظاہرہ کر رہی تھیں ۔بازار میں سبھی کے بیاہ ہوتے چلے آئے ہیں ۔لیکن اس شاہانہ انداز میں، یہ شاید پہلی مثال تھی ۔

میز کے آخری کونے پر چار عورتیں دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں ۔

''حرافہ آسمان سے چاند توڑ لائی ہے ۔''

آواز میں جلن ہی جلن تھی ۔

''ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا ۔دماغ پہلے ہی آسمان پر رہتا تھا ۔اب تو خیر کچھ بات ہی نہ کرو ۔'' دوہری ٹھوڑی والی عورت نے کہا ۔

''اللہ قسم کیا ناک کرنشانہ لیا ہے کہ اس کے دماغ کی داد دینی پڑتی ہے ۔'' یہ ایک چالیس سالہ عورت کی آواز تھی ۔

''نواب داؤ دبھی خسارے میں نہیں رہے گا ۔دو دو چاند کھیلنے کو ملیں گے ۔بیٹی سے دل بھر لے گا تو ماں بہلائے گی ۔اور ماں سے اکتاہٹ محسوس ہوگی تو بیٹی سنبھالے گی ۔''

''بیٹی بہلانے سے رہی ۔یہ بات چھوڑ دو جاناں تم ۔''

''ایک ایک زیور ہزاروں سے کم کی مالیت کا نہیں ۔بیشتر میں تو ہیرے جڑے ہوئے ہیں ۔بھئی کہنا پڑتا ہے قسمت کی دھنی ہے ۔'' جاناں نے کہا ۔''

''اور حق کتنا کیا ہے ۔۔۔۔۔؟ ایک انیس سالہ شرانٹ لڑکی شمو نے پوچھا ۔

''سوالاکھ '' جاناں بولی ۔

''سوالاکھ !'' سب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ۔

''یہ ٹھاٹ بھاٹ سب یونہی تو نہیں ۔''

''تم نے عروسی لباس دیکھا ہے شمو؟'' لالی نے پوچھا ۔

''نہیں !''

''قسم خدا کی آنکھ نہیں لگتی ۔ہزاروں کا کام ہوگا۔''

''پہلے ممتاز بائی کا ستارہ جو بن پر تھا اب بیٹی کا ہوگا۔اور بیٹی حسن میں ماں کو مات کرتی ہے۔''۔۔۔۔۔۔جاناں بولی۔

''مجھے امید نہیں کہ وہ ماں کی گدی سنبھال سکے۔عجیب فطرت کی لڑکی ہے۔تم نے دیکھا ہوگا۔جاناں، خاموش خاموش سی رہتی ہے۔بیمار حسن کیا کسی کو کھینچے گا؟''شمونخوت سے بولی۔

''یہ رنگ دیکھنا کتنی جلدی اڑتے ہیں اسے ماں کی طرز زندگی سے نفرت ہے۔شمو ٹھیک کہتی ہے کہ بیمار حسن کسی کو کیا کھینچے گا۔مجھ سے پوچھو ساتھ رہتی ہوں۔کیا نہیں جانتی روز روز ماں بیٹی میں کل کل ہوتی رہتی ہے۔چمکی نے تفصیل بتائی۔

''میں نے بھی سنا ہے مگر ایسا کیوں ہے؟ دوسری میز سے دھیمی دھیمی آوازوں میں یہ تبصرے سن کر سترہ سالہ لڑکی نے شمو سے پوچھا۔

''جانے ہماری بلا''شمو نے کندھے اچکائے۔

''چمکی !ممتاز پٹائی نہیں کرتی اس کی؟''

''ارے لاڈلی ہے نا۔۔۔۔۔ڈھیل دے رکھی ہے۔اس کے ہاتھ لگیں گے تو راہ راست پر آجائے گی۔ممتاز بائی کے کاٹے کا تو پانی نہیں مانگتا لڑکی کو درست کرنا کون سا مشکل ہے۔ممتاز بائی کی ایک حمایتی بولی۔

''شرو !تمہارا مطلب ہے ابھی اس نے ہاتھ ہی نہیں لگائے۔روز مار کٹائی ہوتی ہے لیکن لڑکی ہی بڑی اڑیل اور ضدی قسم کی ہے یاد رکھنا میری بات یہ اسے ناک چنے چبوائے گی۔''

''کیا کسی کو پسند کرتی ہے؟''لیلیٰ نے پوچھا۔

''جو اطلاعات مجھے ملتی رہتی ہیں ان کے مطابق تو سوال نہیں۔غیب کا علم اللہ جانتا ہے۔

''ارے چھوڑو جب بستر گرم رہنے لگے گا تو سب کچھ بھول جائے گی، وہ تمہیں یاد نہیں شبو۔کتنا تنگ کیا تھا اس لڑکی نے کیسا بھاگتی تھی۔دیکھو اب ۔۔۔۔۔دونوں ہاتھوں سے لوٹتی ہے۔کیا نخرے اور ادائیں ہیں ہیں اس کی۔''ثمرو نے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔

''تمہارا بھی تو بیاہ ہوا تھا۔لیکن اتنی دھوم دھام تو نہ تھی۔''زرغونہ کی عمر کی لڑکیوں کے حلقے میں گفتگو ہو رہی تھی۔

''ارے ہماری اتنی تیز قسمت کہاں؟''نفیسہ نے حسرت سے کہا۔

''زرغونہ نظر نہیں آ رہی ہے۔آج تو اس کا پاؤں زمین پر ٹک نہیں رہا ہو گا''بینا نے کہا۔

ہم کو تو ذرا پسند نہیں۔اتنی خودسر اور بدمزاج لڑکی ہے کہ بات کر کے کوفت ہوتی ہے۔''مسلونی نے ناک چڑھاتے ہوئے آنکھیں مٹکائیں۔

''انگریزی پڑھ گئی ہے اسی لئے دماغ اونچا ہو گیا ہے۔''رجو نے کہا۔

''چلو اسے دیکھتے ہیں۔''

اور زرق برق لباس پہنے قہقہے لگاتا ایک دوسرے کو مذاق کرتا لڑکیوں کا یہ غول زرغونہ کے کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔دروازہ باہر سے بند تھا۔ایک لڑکی نے کھولنے کی کوشش کی۔تبھی سرلا بائی ہنستے ہوئے سامنے والے کمرے سے چلائی۔

''شنو بیٹی ! دروازہ نہ کھولو۔زرغونہ سو رہی ہے۔اس کے سر میں درد ہے۔''

''یہ کیا بات ہے اٹھاؤ اسے۔''رجو نے منہ بگاڑا۔

''ایک گھنٹہ اور صبر کرو۔ذرا سو لینے دو۔تم ہی لوگوں نے اس کے پاس رہنا

ہے۔" سرلا بائی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"چلو سونے دو بیچاری نے رات بھر جاگنا ہے۔" نفیسہ نے کہا۔

او رٹھٹ کا ٹھٹ قہقہے لگاتا ہوا دوبارہ سیڑھیاں اترنے لگا۔

باب نمبر:۶

سفید براق ہتھیلی پر رکھی گولیوں کو وہ جانے کب سے دیکھ رہی تھی ۔اسے تو کوئی ہوش نہ تھا۔آنے والے لمحات کے متعلق سلگتے خیال دل کی گہرائیوں سے اٹھ اٹھ کر ذہن کی وسعتوں میں پھیلے جا رہے تھے ۔اور ذہن کی شفاف سطح دھندلا رہی تھی۔

یونہی ہتھیلی پر جمی آنکھیں اٹھائیں ،سامنے ڈریسنگ ٹیبل کا قد آدم آئینہ تھا۔اس پر نظر پڑی۔آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔اپنی آنکھوں کی ویرانی سے خود اسے خوف آنے لگا۔یوں لگا جیسے کوئی مردہ مرقد سے بھاگ آیا ہو۔

گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔لیکن سر چکرا رہا تھا۔ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا محسوس ہوا۔پس و پیش ،چپ و راست ہر سو اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔جیسے گہرے تاریک بادلوں نے کمرے میں ہلہ بول دیا ہو۔بھاگ کر دریچے کی طرف گئی۔وہاں سے پھر بھاگی ۔صوفے کی طرف آئی ۔اور سر صوفے سے ٹکا کر قالین پر بیٹھ گئی ۔بازو صوفے پر پھیلے

ہوئے تھے ۔اوران کے درمیان اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا ۔مٹھی بند تھی ۔

باہر شور کیسا ہے؟ کہتے ہیں آج میرا بیاہ ہے ۔آج مجھے دلہن بننا ہے یہ کیسی شادی ہے جس کا میں سوگ منارہی ہوں ۔

اس کی آنکھیں دوبارہ بند ہوگئی تھیں ۔انجانی منزل کی مدھم مدھم جھلکیاں آنکھوں کے سامنے ابھرنے لگیں امید کے خوشنما پھول حدنظر تک کھل گئے ۔آرزوؤں کی ننھی ننھی کلیاں چٹک گئیں ۔رنگ وبو کی اس وادی میں معطر ہواؤں اور خوشبوؤں کا راج تھا۔

کہاں ہو تم ؟

اس نے چونک کر سر اٹھایا ۔آنکھیں بھر آئی تھیں ۔

فریب خیال کا یہ حسین تصور ۔۔۔۔۔۔یہ فرار ۔۔۔۔۔۔یہ سراب ہے، زرغونہ !

اس کے لہجے میں یاس کی تلخی تھی ۔

''تم بھٹک رہی ہو تمہیں دھوکا ہوا ہے ۔تم نے فریب کھایا ہے تمہاری دنیا میں پھولوں کا کیا کام؟اس دنیا میں خوشبوئیں کہاں؟ یہاں جسم بکتے ہیں ۔آبروئیں لٹتی ہیں ۔اور عفت وعصمت اپنی بے حرمتی پر آنسو بہاتی ہے ۔'' اس کا چہرہ زرد ہورہا تھا ۔

''تم خوش قسمت ہو ۔جسے نواب داؤد نے پسند کیا ہے ۔'' سرلائی بائی کے الفاظ کانوں میں گونجے ۔

''خوش قسمت !''

اس کے خشک ہونٹوں پر کھوکھلی طنزیہ ہنسی نمودار ہوئی ۔

''زرغونہ اگر مہتاب ہے تو میں نے اس کے لئے آسمان سے آفتاب اتارا ہے ۔'' یہ ماں کی آواز تھی ۔جنم دینے والی ماں کی ۔

'' آفتاب اور مہتاب کی جوڑی ۔''

گولیاں ایک بار پھر اس کے سامنے تھیں۔زخمی نگاہوں سے وہ انہیں ایک بار پھر دیکھ رہی تھی۔

’’آفتاب اور مہتاب کبھی نہیں ملے اور نہ ملنے چاہئیں۔‘‘اس نے گونج دار آواز میں خود سے کہا۔

چہرے پر عزم جھلکنے لگا۔مایوسیاں کیوں دور بھاگ گئیں۔زردی کی جگہ سرخی نے لے لی۔

’’تم نے کیا سمجھا ہے کہ تم ہر انسان کو اپنے سانچے میں ڈھال لوگی؟یہ تمہاری بھول ہے۔

کاش !تم نے کبھی کنول کے پھول کو دیکھا ہوتا۔دیکھا تو میں نے بھی نہیں لیکن سنا تو ہے کہتے ہیں وہ کیچڑ میں کھلتا ہے لیکن پھر بھی اس کی سفیدی پر کوئی فرق نہیں آتا۔اپنی زندگی پر غور کرتی ہوں تو خود کو اسی پھول کی طرح پاتی ہوں۔‘‘

’’میں زندگی کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دوں گی لیکن جو تم چاہتی ہو وہ کبھی نہ ہونے دوں گی۔اس گھر کو میں نے اپنے لئے جہنم سمجھا میں چاہتی تو یہاں سے بھاگ سکتی تھی۔لیکن میں جانتی ہوں باہر اس سے بھی بڑے جہنم ہیں۔اس نیلے آسمان کے نیچے مجھے تو اپنے لئے کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔‘‘وہ دیوار پر آویزاں ممتاز بائی کی تصویر سے مخاطب تھی۔

پانی سے لبریز گلاس اس نے اٹھایا۔ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔گولیوں کو ایک بار پھر دیکھا۔اور گلاس قریب پڑی ہوئی تپائی پر رکھا۔

موت و زیست کے درمیانی جانگسل لمحات اپنی ہولناکیوں سے آنکھوں کے سامنے آئے۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔گولیاں ایک کے بعد ایک حلق سے نیچے اترتی

گئیں۔پانی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے اس نے گلاس خالی کر کے تپائی پر رکھ دیا۔اور بستر پر دراز ہوگئی آہستہ آہستہ اپنا وجود فضا میں تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

اس دل خراش سانحے سے بے خبر ممتاز بائی سرلا بائی اور گھر کے ملازمین انتظامات میں مگن تھے۔گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔زرغونہ کی نتھ اتروائی کی تقریب تھی۔نواب داؤد کی تشریف آوری تھی۔کوئی مذاق نہ تھا۔

دنوں بہنیں مسرور تھیں۔

خوشی سے پھڑک رہی تھیں۔

گلنار چہروں سے رقیبوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

آخر کیوں نہ ہوتیں۔

حریف پٹ رہے تھے۔زرغونہ کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔جس کے سامنے چاند ستاروں کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے۔

''سرلا وقت ہو رہا ہے۔نواب داؤد کوئی دم میں آیا چاہتے ہیں۔زرغونہ کو تیار کرواؤ''۔۔۔۔۔۔ممتاز بائی نے اس کے پاس آ کر تیز تیز آواز میں کہا۔

''تم سازینہ کو یہاں بھیج دو۔میں یہ چیزیں اس کے حوالے کردوں۔اور ہاں سرلا''۔۔۔۔وہ جاتے جاتے پلٹی۔

''سارا زیور اپنی نگرانی میں پہننانا۔سمجھیں نا!''

''اچھا''

خادمہ سے سامان اٹھوائے سرلا بائی زرغونہ کے کمرے کے سامنے پہنچ کر رکی۔آہستگی سے کنڈی کھول کر دروازہ کھولا۔اور اندر آگئی۔

''اسے میز پر رکھ دو اور تم جاؤ۔اور سنو دروازہ کے باہر بیٹھ جانا اگر کوئی اندر آنا

چاہے تو اسے کمرے میں مت آنے دینا۔''

''جی بائی جی۔۔۔۔۔۔بہت اچھا''۔۔۔۔۔کہتے ہوئے خادمہ باہر چلی گئی۔

''زرغونہ بیٹے !زرغونہ بیٹے اٹھو رات ہو رہی ہے۔

اٹھو زرغونہ!۔۔۔۔''سرلا بائی نے جھنجھوڑا۔

اس بار اس کی آواز میں تیزی تھی۔اور وہ اس پر جھک گئی تھی۔

لیکن وہاں پکار کا کوئی جواب نہ تھا۔گھبرا کر اس نے اسے اپنی طرف کیا۔

''زرغونہ ! زرغونہ !''اس نے زرغونہ کے دونوں بازو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالے لیکن وہاں کیا تھا۔

اسے بے حس و حرکت دیکھ کر اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی سر گھوم گیا۔دوبارہ اسے اچھی طرح ہلایا۔وہ ساکت تھی۔ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

زرغونہ !وہ دیوانوں کی طرح ہاتھ ہوا میں ہلاتے ہوئے چلائی۔

''یہ کیا کیا زرغونہ؟ یہ کیا ہوا؟''

وہ دھم سے اس کے اوپر گر پڑی۔

چیخنے چلانے کی آواز کمرے سے باہر بیٹھی خادمہ کو سنائی دی تو وہ جھپٹ کر کمرے میں آئی۔یہ صورتحال دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو اٹھی۔

''بائی جی۔۔۔۔۔بائی جی! کیا بات ہے؟''اس نے زرغونہ پر گری سرلا بائی کو الگ کرتے ہوئے کہا۔

''گلو !''سرلا بائی نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

''ممتاز کو بلاؤ،لیکن کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔''

خادمہ بھاگی بھاگی نیچے گئی۔عورتوں کے مجمع میں سے بمشکل ممتاز بائی

کوڈھونڈا۔اور اسے اوپر جانے کا اشارہ کیا۔اس کی اڑی اڑی رنگت کسی خطرے کی علامت تھی ۔تیز نظروں سے اسے گھورا۔اس کی آنکھوں میں راز تھا۔دل خوف ناک انداز میں دھڑکا۔۔۔۔۔۔بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھیں کمرے میں داخل ہوئی۔سرلا کو اس پر جھکے دیکھ کر ہاتھ پاؤں میں شدید سنسناہٹ کا احساس ہوا۔

''سرلا کیا بات ہوئی ؟''اس نے پھولتی سانسوں کے درمیان بمشکل کہا۔

''زرغونہ کو دیکھو''اس کی آواز ہچکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی ۔

سردی کی یخ لہر سارے جسم میں رینگ گئی ۔پاؤں بمشکل گھسیٹے اور پلنگ کی طرف بڑھی ۔

جھکی

اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔

آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک پھیل گئیں ۔تخیلاتی محل زمین بوس ہوتے نظر آئے۔

سرلا !اس نے بے جان ہاتھوں سے پلنگ کی پٹی پکڑ لی۔پیشانی کو پٹی سے مسلتے ہوئے وہ چلا اٹھی ۔

''میرے خوابوں کی تعبیر اتنی ہولناک !یہ کس جرم کی سزا ہے؟ یہ کس جرم کی سزا ہے؟ کس جرم کی؟ کچھ تو بتاؤ۔۔۔۔کچھ تو سمجھاؤ۔۔۔۔۔میں پاگل ہو جاؤں گی زرغونہ!

اس کی یہ حالت دیکھ کر سرلا اپنے غم بھول گئی ۔

باہر سے ڈھپ ڈھپ کی آوازیں سنائی دیں ۔

''خدا کے لئے ممتاز ہوش کرو۔تمہاری یہ حالت میرے بھی ہاتھ پاؤں پھلائے دے رہی ہے۔''سرلا بائی نے اسے کندھوں سے پکڑ لیا۔

''میں ہوش۔۔۔۔۔میں ۔۔۔۔۔آنا۔۔۔۔نہیں چاہتی۔۔۔۔۔مجھے مرجانے دو۔۔۔۔۔سرلا۔۔۔۔۔۔مجھے چھوڑ۔۔۔۔۔دو۔۔۔۔۔اس نے پلنگ سے سر ٹکرایا۔

''خود پر قابو پاؤ۔یہ آہ وزاری کا وقت نہیں۔گھر دشمنوں سے بھرا پڑا ہے۔ہمیں اس صورتحال کا مقابلہ کرنا ہے۔''

باہر نوکرا ور لڑکیوں کے درمیان خاصی کشمکش معلوم ہو رہی تھی سرلا بائی نے فوراً اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔

''ممتاز اٹھو ! حوصلہ کرو۔ان سب کو اب رخصت کر دینا چاہئے۔میں کسی ڈاکٹر بلوانے کے لئے بھیجتی ہوں۔''

''مرنے۔۔۔۔۔دو۔۔۔۔۔اسے۔۔۔۔۔سرلا۔۔۔۔۔ہمیں۔۔۔۔اس۔۔۔کی۔۔۔ضرورت۔۔۔نہیں۔۔۔۔''

''ممتاز !ان نازک لمحوں میں اپنے حواس پر قابو پاؤ۔صورتحال کو سنبھالو میں باہر جارہی ہوں۔''

بمشکل اس نے اسے اٹھایا۔چٹخنی نیچے گرانے سے قبل سرلا بائی نے اپنے آنسو صاف کئے۔چہرے پر بشاشت لانے کی مقدور بھر کوشش کی۔باہر نکلی ہی تھی کہ لڑکیوں کا جمگھٹا راستہ روکے کھڑا تھا۔

''یہ کیا بات ہے اندر جانے دیں نا؟وہ پاؤں پٹختے ہوئے بولیں۔

''رنگونہ کی طبیعت ٹھیک نہیں نفیسہ !شور مت کرو''

''کیا ہوا اسے؟سبھی حیرت سے یک زبان ہو کر بول اٹھیں۔

اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔''

''بخشو !''اس نے وہیں سے نوکر کو آواز دی۔

''جی بائی !ملازم دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا آیا۔

''فوراً جاؤ اور ڈاکٹر صاحب کو بلا لاؤ۔دیکھو ایک منٹ کی دیر نہ ہو۔''

''کیا ہوا بائی جی؟''

''چل دفع ہو پہلے کام کر۔''سرلا بائی نے ڈانٹ دیا۔

''ہم زرغونہ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔''سبھی بولیں۔

''دیکھو اس وقت اس کے پاس جانا ٹھیک نہیں صبح دیکھ لینا۔''اس کے لہجے میں خاصی بیزاری سی تھی۔اور آناً فاناً سارے گھر میں یہ خبر پھیل گئی۔

''کیا ہوا ؟ کیا بات ہے؟ایک دوسری سے سرگوشیوں میں پوچھا جا رہا تھا۔آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہو رہے تھے۔دبی دبی مسکراہٹیں ہونٹوں پر نمودار ہو رہی تھیں۔

''سرلا کیا زیادہ طبیعت خراب ہے۔''جاناں نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بھئی !اس نے خاصی تلخی سے کہا۔

زرغونہ کی حالت کے پیش نظر اس نے سب سے چلے جانے کی درخواست کی---

''صاف کیوں نہیں کہتیں کہ لڑکی نے کچھ کھا لیا ہے۔پردے ڈال رہی ہیں۔''چمکی چہک رہی تھی۔

اور تھوڑی دیر بعد گھر خالی ہو گیا۔سرلا بائی کو اس وقت اپنی پڑی تھی۔اس نے ان کی فقرے بازی پر قطعاً توجہ نہ دی،ڈاکٹر کا شدید انتظار تھا۔

اور عین اس وقت نواب صاحب کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔بھاگ کر سرلا نے ممتاز

بائی کو اطلاع دی۔

یہ المناک حادثہ اور اس پر ستم نواب صاحب کی آمد ،اس کا ذہن اپنی بے بسی اور لاچارگی پر ماتم کراٹھا نمکین پانی کے گرم گرم چشمے ابل پڑے۔وہ تو سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس ناگہانی حادثے کا سبب وہ کیا بتائے گی؟

''آہ گھر آئی مایا کی دیوی واپس پلٹ جائے گی۔خوشیاں گلے ملنے سے پہلے ہی رخصت ہو جائیں گی۔''

''ممتاز کیا سوچ رہی ہو'' یہ سوچنے کا وقت نہیں جاؤ؟۔۔۔وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔بوجھل اور ڈگماتے قدموں سے کمرہ خاص کی طرف بڑھنے لگی۔۔۔۔رخساروں پر آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ رہی تھیں۔

نواب داؤد گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ چکا تھا۔اسے اس ابتر حالت میں کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ پریشان ہوا تھا۔بے قراری سے اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔

''سدا مسکراتے رہنے والے اس چہرے پر رنج و غم کے یہ سائے کیسے ہیں؟

''عالی جاہ!'' رندھے ہوئے گلے سے صرف یہی دو لفظ نکل سکے کچھ بتانے کی کوشش کی۔لیکن آنسوؤں کی یورش تیز ہو گئی۔

''ممتاز بائی! ہمارے ضبط کا امتحان نہ لو۔ہم تمہارے آنسوؤں میں بہے چلے جارہے ہیں۔اللہ ہمیں بتاؤ تم پر کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟''

اس کے لہجے میں درد تھا اور مضبوط ہاتھ اس کے شانوں پر۔

''سرکار !۔۔۔میری زندگی کا۔۔۔۔۔قیمتی ۔۔۔۔۔اثاثہ۔۔۔۔مجھ ۔۔۔سے۔۔۔چھن رہا۔۔۔۔۔۔ہے۔۔۔۔۔ مجھ ۔۔۔۔۔سے۔۔۔۔ چھن رہا۔۔۔۔۔ہے۔۔۔'' وہ ہچکیوں کے درمیان یہی کہہ سکی۔

''ہم سے کھل کر بات کرو ممتاز! ہمیں اپنی مصیبت سے آگاہ کرو۔ تمہارے پیار پر ہم اپنی ساری دولت نچھاور کرنے کے لئے تیار ہیں۔''

''میری بدنصیبی کا۔۔۔۔۔ماتم کیجئے سرکار'' ہونٹوں کے گوشوں کو جنونی انداز میں کاٹتے ہوئے اس نے کہا۔

''پہلیاں ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ ہمیں حقیقت سے آگاہ کرو۔'' اس نے ممتاز بائی کو بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھورا۔

''سرکار !زرغونہ نے غلطی سے کچھ کھالیا ہے۔۔۔۔۔معلوم نہیں۔۔۔اس میں زندگی کی۔۔۔۔۔رمق۔۔۔۔باقی بھی ہے۔۔۔۔۔یا وہ ختم ہوگئی ہے۔'' آواز میں کہیں تیزی اور کہیں دھیما پن تھا۔

''زرغونہ !'' نواب داؤد نے حد درجہ گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''وہ کہاں ہے، ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔''

اور جب وہ اس کے کمرے میں داخل ہوا تو سرلا بائی کی ہچکیاں کمرے کے سکوت کو توڑ رہی تھیں۔ ڈاکٹر ابھی تک نہ پہنچا تھا۔

حسین قیامت خیز سراپے کو بغور دیکھا۔

یہ بت طناز جس کی دید کے بعد وہ اپنا ذہنی سکون کھو بیٹھا تھا۔ پتھر کی کسی تراشیدہ مورتی کی مانند بستر پر پڑا تھا۔

''قسمت تجھے کیا کہوں۔۔۔۔تو نے ایک پیاسے کو پیاس بجھانے سے قبل ہی محروم کر دیا۔ یہ حسین نازنین جو اس وقت موت و حیات کی سرحدوں پر کھڑی ہے۔ آج ہمارے پہلو میں ہوتی۔ اس نوشگفتہ کلی کی خوشبو، ہم سونگتے اور ہماری روح سرشار ہوتی۔''

آگے بڑھ کر ہاتھ پکڑا۔ جسم ابھی گرم تھا۔

آس سی بندھی۔

تبھی ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔

معائنے کے بعد اسے فوراً ہسپتال لے جانے کے لئے کہا۔ تاخیر مضر تھی۔ اسی وقت اسی لمحے اسے کار میں ڈال کر سرلا بائی ایک نوکر کے ہمراہ ہسپتال چل پڑی۔

''لیکن ممتاز بائی یہ سب کیسے اور کیوں ہوا۔''

ان کے جانے بعد نواب داؤد نے پوچھا۔

''سرکار! وہ مجھے یہ گولیاں استعمال کرتے دیکھتی تھی۔ پچھلے چند دنوں سے بے خوابی کی شکایت کر رہی تھی۔ غالباً نیند لانے کے لئے استعمال کیں۔ لیکن مقدار سے لاعلم ہونے کی بنا پر زیادہ استعمال کر گئی۔'' اس نے کمال چالاکی سے نواب داؤد کے اندیشوں کی تردید کی۔

''بہر حال گھبرانے اور فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہارے غم میں شریک ہیں۔ ہم زرغونہ پر روپیہ پانی کی طرح بہادیں گے۔ اسے دیکھنے کے لئے جانے سے تو ہم معذور ہیں۔ لیکن ہمارا دل ہر وقت اس کے پاس رہے گا۔ آؤ ممتاز کمرہ خاص میں چلیں اور اس ناگہانی غم کو غلط کرنے کی کوشش کریں۔''

اور چند لمحوں کے بعد وہ کمرہ خاص میں جام ہونٹوں سے لگائے نشے میں جھوم رہے تھے۔

باب نمبر:۷

موت وحیات کی آنکھ مچولی دو یوم تک جاری رہی ۔دن میں چند مرتبہ ممتا زبائی کی سسکیاں کمرے کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کرتیں۔ان سسکیوں میں کاروبار چوپٹ ہو جانے کی پکارسنائی دیتی ۔اس کے بے ہوش سفید چہرے پرنظر پڑتے ہی وہ کبھی ایک بے بس اور مجبور عورت نظر آتی اور کبھی غیظ وغضب سے تڑپتی مچلتی ایک مضطرب عورت۔کبھی کبھی جب اسپر بے بسی طاری ہوتی تو اس کا دل چاہتا کہ وہ جھک کراس کی بند آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دے۔اس کی صبیح پیشانی چوم لے۔

ان احساسات کی عمر بہت مختصر ہوتی۔کتنے جانے پہچانے چہرے طنزیہ ہنسی لئے اردگرد پھیل جاتے۔

یہ اس کے حریفوں کے چہرے تھے۔دشمنوں اور حاسدوں کے چہرے تھے۔ایک ایک کے چہرے پر پھیلی تمسخر کی لکیریں اسے نمایاں نظر آتیں۔وہ بے چین ہو اٹھتی۔مٹھیاں بھینچ لیتی۔رگ رگ میں بھڑکتے انتقامی شعلے اس کو سرخ انگارہ بنا

دیتے ۔دیوانہ وار کمرے میں چکر کاٹتی اورتب اس کا جی چاہتا کہ وہ اس کا گلہ گھونٹ ڈالے۔آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ اس ارادے کی تکمیل کے لئے اس کی طرف بڑھتے جاتے ۔لیکن جب اس کی گردن کو چھونے لگتے تو چونک کر وہ پیچھے ہٹ جاتی ۔ہاتھ ٹوٹی ڈالیوں کی طرح گر جاتے اور بے دم ہوکر وہ کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیتی۔

''میں اسے اس کے انجام تک کیوں نہیں پہنچا دیتی؟''۔۔۔۔

وہ سرلا بائی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھورتی۔''

''کچھ دیوانی ہوگئی ہو؟یہاں آکر اول جلول باتیں کرنے سے بہتر ہے کہ گھر پر رہا کرو۔

جس راز کو چھپانے کے لئے ڈھیروں پیسے دے کر پولیس کا منہ بند کیا۔میں خائف ہوں کہیں تمہاری بکواس اسے افشانہ کر ڈالے۔''وہ خفگی کا اظہار کرتی ۔

''لیکن مجھے یہ بھی سمجھا دو کہ ہم نے اسے زندہ رکھ کر کیا کرنا ہے۔روز روز کے مرنے سے کیا یہ بہتر نہیں ہم ایک ہی بار مر جائیں۔''

شکست خوردہ آواز میں کسی ہارے جواری کا سا دکھ شامل ہوتا۔

''کوئی انوکھی بات نہیں ہوئی ۔یہ دنیا ہے اور اس میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔''۔۔۔وہ بظاہر خاصے اطمینان سے کہتی۔

''تم کتنی مطمئن ہو کیسے یہ سب کہہ رہی ہو۔سرلا !میری تو کمر ٹوٹ گئی ہے۔بازار میں آتے جاتے میں نگاہیں نہیں اٹھا سکتی ہوں۔مجھے تو لگتا ہے جیسے کھڑکیوں میں سے ہزاروں آنکھیں میرا مذاق اڑا رہی ہیں۔''

کتنی بے چارگی تھی اس کی آواز میں۔سرلا بائی کا دل کٹ سا جاتا۔

''اتنی جلدی حالات سے مایوس نہیں ہوتے ممتاز !اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔بتاؤ

تم رات سوئی تھیں؟''

لیکن وہ اس بات کونظر انداز کرتے ہوئے پوچھتی ۔

''تمہارا کیا خیال ہے یہ بچ جائے گی؟''

''ڈاکٹر تو کافی پرامید ہیں؟''

''اسے بچنا چاہیئے اسے زندہ رہنا چاہیئے ۔سرلا اس حرام زدای نے جیسے ہمیں تڑپایا ہے ۔اس نے جیسے ہمیں رسوا کیا ہے ۔میں اسے ایسے ہی جلاؤں گی ۔اس کے کوئلے کروں گی ۔اس کا خون پیوں گی ۔یہ کتیا کیا ہمیں خوار کرنے کے لیے پیدا ہوئی تھی ۔میں ۔۔۔میں ۔۔۔۔میں''وہ اپنے رنگ پر اتر آتی ۔

اس کے جسم کے بال غصے سے کھڑے ہوجاتے ۔آنکھوں میں خون اترنے لگتا ۔۔۔سرلا بائی اسے پکڑلیتی ۔

''تمہیں اللہ کا واسطہ ممتاز ! اپنے آپ میں رہو ۔یہ ہسپتال ہے ۔تمہارا کوٹھا نہیں ۔جہاں تمہاری گالیوں کو گھی کے تر نوالے سمجھ کر نگلا جاتا ہے ۔کوئی سنے گا تو کیا کہے گا؟''

وہ اس کے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر ملتجی لہجے میں کہتی ۔اس کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ۔ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوتا ۔وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف لپکتی ۔جب تک وہ اس پر جھکا اسے دیکھتا رہتا ۔وہ بھی اس پر نظریں جمائے رکھتی ۔جونہی اس کا سر اوپر اٹھتا فوراً پوچھتی ۔

''ڈاکٹر یہ کب تک ٹھیک ہوجائے گی؟''

''کچھ کہا نہیں جاسکتا ۔''

ڈاکٹر چارٹ پر لکھتے لکھتے کہتا ۔

''ڈاکٹر یہ بچ جائے گی؟'' وہ گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھتی۔

''دعا کیجئے !''

ڈاکٹر سکون سے جواب دیتا ہوا پھر اس پر جھک جاتا۔

''دعا !'' خود سے الجھ پڑتی۔

''کیا دعا مانگوں؟ کیسی دعا مانگوں؟ تو ہی فیصلہ کرا ے خدا کہ مجھے تجھ سے کیا مانگنا چاہیئے؟ میں اس کی زندگی کے لئے تجھے کہوں یا موت کے لئے؟''

مرمریں پیشانی پر شکنیں لیے وہ کچھ سوچتی۔۔۔آنکھوں میں آنسو جھلملاتے۔۔۔ہاتھ دھیرے دھیرے اوپر اٹھ جاتے اور ہونٹ ہلتے رہتے۔

موت کے نوکیلے اور خونیں پنجوں کے چنگل سے آزاد ہو کر زرغونہ نے آنکھیں کھولیں۔چند لمحوں تک اجنبی ماحول کا جائزہ لیا۔کربناک خیال ذہن کے کسی گوشے میں رینگا۔اور لمحہ بھر کو تمام ذہن اس کی تلخ کڑواہٹ سے متاثر ہو گیا۔

''میں موت کی بازی ہار بیٹھی ہوں سوچا تھا کہ وقت کے کٹھن لمحات جو ہر پل میری عصمت کے لئے چیلنج بن رہے ہیں۔ختم ہو جائیں گے۔آہ !لیکن جو چاہا وہ نہ ہوا''

دن میں دو تین بار اس کی آنکھیں کھلتیں۔۔۔اضطراب وغم کی بپھری ہوئی موجیں اسے ایک تنکے کی طرح بہا کر گہرائیوں میں لے جاتیں۔وہ ڈوبتی چلی جاتی۔دیوانے کی طرح سہارے کے لئے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتی لیکن سہارا نہ ملتا۔''

اور اس سے اس کے سینے میں شدت جذبات سے تلاطم برپا ہو جاتا۔آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپک پڑتے۔تڑپا دینے والے لہجے میں وہ خود سے گویا ہوتی۔

''میں نے اپنے ماحول کے رخسار پر بھرپور طمانچہ رسید کیا تھا۔تاکہ دنیا جان لے کہ حالات جب خلاف فطرت حرکات پر اکساتے ہیں تو زندگی اپنی رعنائی کھو بیٹھتی ہے۔اور

موت وزیست کے درمیانی فاصلے پل بھر میں سمٹ جاتے ہیں۔خدایا ! یہ سمٹے اور سکڑے ہوئے فاصلے ایک بار پھر کیوں اپنی وسعتوں سے میرے سامنے آگئے ہیں؟''

پرشفقت سی دو متضاد آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرائیں۔ایک آواز معمر ڈاکٹر کی تھی۔جو اس کے دائیں طرف کھڑا تھا۔اور دوسری آواز نرس کی تھی۔جو بائیں طرف کھڑی تھی۔

آنکھیں کھول کر اس نے خلوص ایثار کے پیکر ان انسانوں کو دیکھا۔جن پر فرشتوں کا گمان ہوتا تھا۔

جی چاہا ان کے دامن پکڑ لے۔انہیں جھنجھوڑ ڈالے۔۔۔۔چیخ چیخ کر ان سے پوچھے کہ یہ تم نے کیا کر ڈالا ہے۔تم لوگوں نے مجھے زندگی دے دی ہے یہ نہ سوچتے ہوئے کہ یہی زندگی میرے لئے عذاب ہے۔میرے لئے لعنت ہے۔

ڈھیروں آنسو آنکھوں سے بہہ نکلے۔

''میری بچی تمہیں کیا تکلیف ہے؟''

نرس اس پر جھکتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں بولی۔

''تکلیف؟''

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے نرس کو گھورا۔

''کاش میں تمہیں بتاسکتی۔۔۔۔کاش میں بتاسکتی۔''

اس کی آنکھوں نے خاموش فریاد کی۔

''بیٹے !مجھ سے بات کرو۔۔۔''ڈاکٹر نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

خلوص و پیار کے اظہار نے ضبط کا بند توڑ دیا۔اس کی سسکیاں نکل گئیں۔

سرلا بائی نے آگے بڑھ کر پیار کیا چمکارا لیکن سسکیاں بتدریج تیز ہوتی جارہی

تھیں۔

ڈاکٹر نے نرس سے انجکشن لگانے کے لیے کہا۔

انجکشن لگا دیا گیا اور تھوڑی دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہوگئی۔شام کے وقت وہ بیڈ کے راڈ پر سر رکھے سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔وہ کمرے میں تنہا تھی۔سرلا بائی کسی کام سے گھر گئی ہوئی تھی۔

کمرے میں داخل ہونے والے دو معصوم بچوں اور دو نوجوانوں کی آمد سے اس کی محویت ختم ہوگئی۔بچوں کے بازوؤں میں پھولوں سے بھری ہوئی خوبصورت ٹوکریاں جھول رہی تھیں۔قریب پہنچ کر بچوں نے ٹوکریوں میں ہاتھ ڈالے اور خوبصورت گلدستے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔بچوں کی آنکھوں میں محبت کی چمک تھی۔آہستگی سے اس نے دونوں گلدستے ان کے ہاتھوں سے پکڑ لیے۔اس کی خوب صورت آنکھیں بچوں پر جمی ہوئی تھیں۔

''آپ کو کیا تکلیف ہے؟''ایک بچی نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

''اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے''لڑکے نے فوراً اپنے ہاتھ دعا کے لئے پھیلا دیئے۔

اور یہ دعائیہ الفاظ اس کے دل پر کسی دہکتے انگارے کی طرح لگے۔بچوں پر مرکوز نگاہوں کا رخ بدلا تو ایک نوجوان کو چاٹ کا عمیق جائزہ لیتے اور دوسرے کو حسن ورعنائی کے ایک اچھوتے شاہکار کو غایت دلچسپی سے دیکھتے ہوئے پایا۔

خود پر جمی آنکھوں کی تپش محسوس کی تو وہ گھبرا اٹھی۔اضطرابی انداز میں پہلو بدلا۔پیشانی پر نا گواری کی شکنیں نمودار ہوگئیں۔

نعیم !چارٹ پر جھکے ہوئے نوجوان نے اپنے ساتھی کو پکارا۔دوسرا نوجوان بھی آگے بڑھ کر چارٹ پر جھک گیا۔

''ہمارے ماموں میاں ڈاکٹر ہیں۔'' بچی نے قدرے تفاخرانہ انداز میں کہا۔

'' آپ کا نام کیا ہے باجی؟'' بچے نے استفسار کیا۔

''میرا نام کچھ نہیں ہے۔''

دھیمی آواز میں کہتے ہوئے اس نے بچے کا گلابی گلابی رخسار پیار سے تھپتھپایا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

دونوں بچوں نے بہ یک وقت یہ جملہ ادا کیا۔

ان کی آنکھوں میں حیرانی نمایاں تھی۔

''ثوبی چلنا نہیں بیٹے؟'' گھمبیر سی اس آواز پر زرغونہ نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ پکارنے والے کے چہرے کی رنگت سانولی تھی۔ سادگی سے آراستہ سر کے بال زیادہ گھنے نہ تھے۔ پیشانی فراخ اور چمک دار تھی ناک ہونٹ گوارا تھے۔ کشیدہ قامت اور جسم مناسب تھا۔ لیکن آنکھیں سارے چہرے کا حسن تھیں۔

اس درجہ خوبصورت، روشن اور چمکتی آنکھیں۔ جن میں خلوص کے دیئے فروزاں لائے تھے جن میں شفقت کے دریا بہہ رہے تھے۔ جانے کیسا سحر تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔

''زندگی ہمارے پاس خدا کا عطا کردہ بیش قیمت عطیہ ہے۔ خودکشی جیسے مذموم فیصلے سے ہم اسے ختم کرنے کے مجاز نہیں۔''

اس کے لہجے میں خلوص کی شیرینی گھلی ہوئی تھی۔

زرغونہ کے سینے سے درد کا ابال اٹھا۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں تاکہ اس ابال کو باہر آنے سے روک سکے۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکی۔ آبی لہریں حسین آنکھوں میں پھیل چکی تھیں۔

آنسوؤں کو پلکوں میں جذب کرنے کی کوشش کی لیکن موتی رخساروں پر لڑھک ہی گئے۔

نوجوان کا سر جھک گیا تھا۔بچے خاموش کھڑے تھے اوراس کا ساتھی نوجوان بھی صورتحال سے خاصا متاثر نظر آرہا تھا۔

''آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

جسم کا رواں رواں مجسم سوال تھا۔

''آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

کانوں میں ایک پرخلوص آواز، جس میں نرمی اور پیار تھا۔گونج رہی تھی آپ نے ایسا کیوں کیا؟ زندگی خدا کا عطا کردہ بیش قیمت عطیہ ہے خودکشی جیسے مذموم فعل سے ہم اسے ختم کرنے کے مجاز نہیں ۔مصائب و آلام آزمائش ہیں ۔خدا کو پکاریئے ۔''اس کی آنکھیں شدت جذبات سے بھیگ رہی تھیں۔

باب نمبر:۸

''احسن رضا!''

میڈیکل ہوسٹل کے ایک کمرے میں نعیم کی شوخ وشنگ آواز گونجی ''ہوں'' کہتے ہوئے احسن رضا نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا۔''کبھی تو اپنی دنیا سے باہر نکلا کرو۔اسکے لہجے میں ہلکی ہلکی خفگی نمایاں تھی۔چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے انہوں نے نگاہوں کا رخ پھیرا قدرے حیرانی سے اسے دیکھا۔اس کی آنکھوں میں احساسات کا عجیب سا رنگ بکھرا ہوا تھا۔دھیمی آواز میں وہ کچھ گنگنا رہا تھا۔

''خیریت؟ آثار کچھ اچھے نظر نہیں آرہے ہیں۔''انہوں نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

''شعلہ کہوں، برق کہوں یا کہ شبنم کہوں؟تم ہی بتاؤ کیا کہوں؟لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھیرے شریر نظروں سے نعیم انہیں گھور رہا تھا۔

''ہوں میں نہ کہوں کہ آج آنکھوں کا رنگ پھر کیوں بدلا ہوا ہے۔تو یہ بات

ہے۔''

میٹھی سی مسکراہٹ احسن کی آنکھوں میں تیر گئی ۔اور لب کھل اٹھے ۔

''بندہ خدا کچھ تو کہو۔''

''میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ نہ شعلہ ہے نہ برق اور نہ شبنم فقط خدا کا تخلیق کردہ ایک انسان ۔''

''مجذا احسن تمہاری یہ سنگ دلانہ حد تک صاف گوئی میرے لطیف جذبات کو کچل ڈالتی ہے ۔کبھی تو اچھے کلمات زبان سے نکالا کرو ۔''

''واہ واہ کیا کہنے ہیں تمہارے لطیف جذبات کے۔''ان کی لطیف مسکراہٹ گہری تھی ۔

''صاحب زادے ! ہم جوان ہیں اور جوان جذبات رکھتے ہیں ۔تمہاری طرح نہیں کہ جوانی میں ہی پیری کا لبادہ اوڑھ بیٹھے ہیں ۔''

''میرا خیال اگر غلطی پر نہیں تو یہ جوان جذبات غالباً ستر بار شعلوں سے جلے ہیں ۔لیکن ہنوز زندہ ہیں ۔اور شاید بہتر بار شبنم کے ٹھنڈے میٹھے قطروں سے بھیگے ہیں ۔پر ابھی بھی خشک ہیں ۔میں پوچھتا ہوں یہ سیراب کب ہوں گے؟''

''کاش کبھی تو پی ہوتی ظالم ۔''

''یہی دعا مانگتے رہو۔''انہوں نے گھورتے ہوئے کہا۔

''سمجھتے کیوں نہیں ۔''نعیم کا لہجہ الجھا ہوا تھا۔

''کیا؟''ان کی معنی خیز نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں ۔

''اف !احسن تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے ۔اتنی کورذوقی کا ثبوت کیوں دیتے ہو؟میری توبہ !جو میں تم سے کوئی بات کہوں ۔دس گھنٹے تمہیں سمجھانے کے لئے

چاہئیں۔بخدا ! میں یہ حماقت کسی قیمت پر نہیں کرنا چاہتا۔نعیم نے سر تکیے پر پٹختے ہوئے کہا۔

''کچھ فرق نہیں پڑتا۔ماشاءاللہ سراپا حماقت ہے۔''انہوں نے جواباً چوٹ کی۔

''لیکن یار! یہ تو بتا دو کہ اس نے خودکشی کیوں کی تھی؟'' نعیم نے تکیے سے سر اٹھایا۔

''مجھے علم غیب نہیں ویسے رات زیادہ نہیں گزری۔چاہو تو بھاگ کر معلوم کر سکتے ہو۔''انہوں نے گھڑی پر نظریں دوڑاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔''ہوں'' تا کہ اس کی پیشانی کی شکنیں مجھے دیکھ کر کچھ اور گہری ہو جائیں۔'' زیر لب مسکراہٹ سے اس نے احسن کو گھورا۔

احسن کا قہقہہ کمرے میں گونج گیا۔

''تو تصورات کے یہ حسین پیرہن کس برتے پر بنائے جا رہے ہیں؟''

''ان کا کیا ہے۔جب چاہا بنا لیا جب چاہا پہن لیا اور جب چاہا اتار دیا۔کوئی مشکل بات نہیں۔''

''خوب !''

وہ بے اختیار ہنس دیئے۔

''سنتے ہیں، محبت کے نقش گہرے اور انمٹ ہوتے ہیں تم کیا کہتے ہو؟''

''ہم اس اصول کے آدمی نہیں۔ایک ہی نقش کے ساتھ چمٹنے سے فائدہ'' بناؤ، مٹاؤ اور نئے بناؤ ہمارا اصول ہے۔''

''تم اور تمہارے اصول دونوں ہی لاجواب ہیں۔'' کہتے ہوئے وہ کتاب پر جھک گئے۔

احسن ان نوجوانوں میں سے تھے۔جو شیش محلوں میں آنکھ کھولتے ہیں آسائشوں کی گود میں پروان چڑھتے ہیں۔اور راحتوں کی فضاؤں میں سانس لیتے ہیں۔لیکن ازلی

مضطرب ہوتے ہیں۔

وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔جو انہیں ان گنت دعاؤں اور منتوں کے بعد حاصل ہوئی تھی۔ارمان بھرے دلوں نے ان کے گرد راحتوں کا حصار قائم کر دیا اور ایک مسکراہٹ کے لئے دنیا کی ہر خوشی خرید ڈالی۔خوشیوں کے ہنڈولوں میں وہ اس وقت تک جھولتے رہے جب تک ان کا شعور سویا رہا۔سوجھ بوجھ ملی،شعور بیدار ہوا۔نگاہوں نے اپنے اردگرد بہت کچھ دیکھا۔دل نے بہت کچھ محسوس کیا تو انہوں نے ایک ہی وار میں خود ساختہ تکلفات کی دیواروں کو پاش پاش کر ڈالا۔لوگوں کی دکھی اور غم ناک کہانیاں انہیں تڑپا دتیں۔ان کی آنکھوں سے جھانکتا آزار ان کے دل کو برمے کی طرح چھید دیتا۔اور تب انہیں اپنا ماحول قطعی اجنبی نظر آتا۔آرام دہ۔پرتکلف بستر ،نوکیلے کانٹوں کا بستر بن جاتا۔مرغن غذا کے نوالے زہر بن جاتے اور ان تکلیف دہ احساسات سے انہیں اس وقت تک چھٹکارا نہ ملتا۔جب تک کہ وہ ان کے درد کا کچھ نہ کچھ درماں نہ کر لیتے۔

قدرت نے انہیں صرف احساس کی دولت سے ہی نہ نوازا تھا۔بلکہ اعلیٰ دماغ بھی عطا کیا تھا۔وہ غیر معمولی ذہانت رکھنے والے فطین اور ذہین نوجوان تھے۔

لیکن بوڑھے والدین کو ان کی خوشیاں دیکھنی نصیب نہ تھیں۔موت کا ظالم ہاتھ بڑھا اور باپ کو گھسیٹ کر لے گیا۔باپ سے شدید چاہت رکھنے والا بیٹا ان کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا۔اور شفقت پدری سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔

پدارنہ محبت سے محروم ہو جانے کا غم ابھی وہ اچھی طرح فراموش بھی نہ کر پائے تھے کہ ایک اور چرکا لگا۔

مقدر نے ماں کی ابدی جدائی کا داغ بھی ان کے سینے پر لگا دیا۔وسیع کائنات میں وہ تنہا رہ گئے۔تن تنہا غموں کی آگ میں جلنے کے لئے ،اپنے زخموں پر آپ ہی پھاہے

رکھنے کے لیے۔

محل نما گھر کے ایک ایک کمرے میں وہ دیوانہ وار گھومتے ۔والدین کی پیار بھری نظریں گھنے سائے کی طرح اپنے تعاقب میں دیکھتے تو پاگل ہو اٹھتے ۔

سر دیواروں سے ٹکراتے ۔۔۔

آنکھوں سے خون چھلکنے لگتا۔

گھنٹوں موت وحیات کے مسئلے پر فلسفیانہ باتیں سوچتے رہتے ۔آخر جب غم کے بوجھ سے روح پس گئی ۔تو ان میں ایک نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔

وہ مذہب کی طرف جھکتے گئے ۔مذہب کی پیار بھری نرم اور ملائم گود نے انہیں سکون دیا۔

اور انہوں نے اپنے زخموں کو خدا کی رضا سمجھتے ہوئے خود سیا۔

اب وہ میڈیکل کے فائنل ایئر میں تھے۔

ان کے سانولے چہرے پر روشن آنکھیں کردار کی پاکیزگی کا نور لئے ہمہ وقت روشن رہتیں۔

قابلیت، ذہانت، عادات واطوار، اخلاق حسنہ اور مال و دولت کے اعتبار سے کوئی لڑکا ان کا ہمسر نہ تھا۔

لینڈ لارڈ ہوتے ہوئے بھی غریبانہ مزاج رکھتے تھے ۔ان کا دامن ہر مجبور بے بس انسان کے لئے کشادہ رہتا اور اسے اس محفوظ پناہ گاہ میں گھسیٹ لیتا۔

میڈیکل سے فارغ ہونے کے بعد وہ پراٹ نامی ایک دورافتادہ پہاڑی بستی میں جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔جہاں ان کے منیم جی آج کل ان کے لئے کلینک اور رہائش گاہ تعمیر کروا رہے تھے ۔شہر چھوڑ کر بن میں جا بسنے کا محرک ایک المناک واقعہ تھا۔

وہ میڈیکل کے تیسرے سال میں تھے اور کالج کے چند لڑکوں کے ساتھ پہاڑی علاقے کی سیاحت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ سارا دن ڈھلانی گل پوش پہاڑیوں پر لڑکوں کے ساتھ گھومتے پھرتے اور فطرت کے حسین نظاروں سے محظوظ ہوتے۔

ایک شام وہ بستی دیکھنے کے لئے گئے۔ یہ خاصی بڑی بستی تھی۔ جہاں غربت اور افلاس کی حکومت تھی۔ اسپتال دیکھا۔ معمولی سی چند دوائیں۔ خستہ حال عمارت اور ایک کمپوڈر نما ڈاکٹر۔ اس ڈاکٹر سے جو حالات سننے میں آئے۔ وہ ان جیسے حساس انسان کو تڑپانے کے لئے کافی تھے۔

ابھی وہ وہیں ہی تھے کہ کسی قریبی گاؤں سے لوگ ایک جوان عورت کو چارپائی پر ڈال کر لائے۔ عورت کو ہیضے کی شکایت تھی۔ اور حالت نہایت ابتر۔ بروقت طبی امداد میسر نہ آنے کی وجہ سے اس نے وہیں دم توڑ دیا۔ اس ایک حادثے کی تلخی ابھی کم نہ ہوئی تھی کہ ایک اور سنگین سانحہ انہیں تڑپا گیا۔

دس سالہ ایک خوبصورت بچہ بھیڑیں چراتے چراتے پہاڑ کی ڈھلان سے پھسل گیا۔ نوکیلے پتھروں سے سر پھٹ گیا۔ سرخ سرخ خون میں لت پت جب اسے ہسپتال لایا گیا تو بے چارا ڈاکٹر اس کے لئے کچھ نہ بھی کر سکا۔ بچے کی حالت مقتضی تھی کہ اسے فوراً خون دیا جاتا۔ لیکن خون دینے کا سامان ہسپتال میں نہ تھا۔ احسن بچے کو لے کر شہر آنے ہی والے تھے کہ بچے نے زندگی سے اپنا ناطہ توڑ لیا۔

ان کی روح ایک گراں بار بوجھ تلے دب گئی۔ انسانی مجبوریوں پر ان کا دل تڑپ اٹھا۔ تب انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ شہر چھوڑ دیں گے۔۔۔ ڈاکٹر بن کر آئیں گے۔

اور ان کراہتے سسکتے زخموں سے چور انسانوں کے لبوں پر صحت مند مسکراہٹ بکھیرنے کی حتی الامکان کوشش کریں گے۔

باب نمبر:۹

سیاہ ریشمی برقعے کی ڈوریاں باندھتے ہوئے اس کی یاس آمیز نظریں نہ جانے کتنی بار فرانسیسی طرز کے بنے ہوئے دریچے میں سے ہوتی ہوئی برآمدے کی طرف اٹھیں اور مایوس ہو کر واپس لوٹی تھیں۔نامعلوم سی خلش گہری ہوتی جارہی تھی۔سرلا بائی اور نوکر کے پیچھے پیچھے وہ کمرے سے نکلی اسے ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا اور وہ گھر جارہی تھی۔برآمدوں میں زرد زرد روشنی والے قمقمے روشن تھے۔اکا دکا لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔

دل بھر آیا تھا۔دیواروں سے لپٹ جانے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے جی چاہ رہا تھا۔

''کون کہتا ہے کہ دل کے صادق جذبے کشش رکھتے ہیں۔''اس نے دکھ سے سوچا۔

''یہ انسانی ذہن کی اختراعات ہیں۔''

رات کی تنہائی میں سوچتے سوچتے جب اس کا ذہن پھٹنے لگتا۔طبیعت گھبرانے لگتی۔تب وہ خاموشی سے اسپتال کے لان میں چلی جاتی۔مخملیں گھاس کے فرش پر لیٹے ہوئے وہ اس دنیا کا مقابلہ اپنی دنیا سے کرتی تو اتنا تضاد نظر آتا کہ دل کٹنے لگتا۔

خنک ہواؤں میں خلوص کی چاشنی میں ڈوبے ہوئے الفاظ کی بازگشت سنائی دیتی وہ سسک اٹھتی۔دل چاہتا کہ یہ دردبھری سسکیاں ان طویل راہداریوں کو طے کر کے اس دنیا میں پہنچ جائیں جہاں وہ روشن آنکھوں والا انسان رہتا ہے۔وہ بھاگتا ہوا آئے اور اس کے کانوں میں کوئی میٹھی سی بات کہہ دے۔

وہ بات جو اس کے قلب و ذہن میں کھولتے لاوے کو منجمد کر ڈالے۔

نہاں خانہ دل کے اندھیروں میں جگمگاتا روشن چراغ رکھ دے۔لیکن اس کی سسکیاں مدھم ہوتے رک جاتیں۔نم آلود آنکھوں سے وہ تاریکی کے غلاف میں لپٹی کائنات کو گھورتی۔کچھ نظر نہ آتا۔خودفریبی کی دنیا میں چند لمحے گزار کر وہ واپس اپنی دنیا میں آجاتی۔سر لابائی سو رہی ہوتی۔اور وہ تھکے تھکے قدموں سے آکر بستر پر دراز ہو جاتی۔

آج وہ پھر اسی غلیظ ماحول میں واپس جا رہی تھی۔

''کاش!میں تمہیں ایک بار پھر دیکھ سکتی۔ایک بار۔۔۔صرف ایک بار۔''اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

لیکن دل میں پیدا شدہ یہ تمنا اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں تلے پامال ہوتی گئی۔

برآمدوں کے موڑ کٹتے گئے۔۔۔آتے جاتے لوگوں کے چہروں کا طواف کرنے والی نظروں میں آس کا دیا بجھتا گیا۔

اسپتال کے بیرونی قمقموں کی روشنی تھوڑی دور تک اس کے ساتھ چلی، پھر خدا

حافظ کہہ کر لوٹ گئی۔

شکست خوردہ انداز میں اس نے کار کی کھڑکی کے شیشے پر سر رکھ دیا۔کھلی آنکھوں میں مکمل تاریکی تھی۔

گھر میں داخل ہوئی۔گھنگھروں اور سازوں کی آواز فضا میں رچی ہوئی تھی۔بدبو کا ایک بھبکا ناک میں داخل ہوتا محسوس ہوا۔طبیعت متلانے لگی۔واپس بھاگ جانے کو دل چاہنے لگا۔

لیکن بھاگ کر کہاں جاتی؟کس شاخ کو نشیمن کے لئے چنتی،افسردہ چال چلتی اپنے کمرے میں آگئی۔برقعہ اتارا۔تہہ کیا اور میز پر رکھ دیا۔

سازینہ دودھ لے کر کمرے میں آگئی۔اسے آنکھوں پر بازو رکھے صوفے پر نیم دراز پایا تو قریب آ کر بازو اٹھاتے قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''زرغونہ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں ٹھیک ہے۔''اس نے بازو دوبارہ آنکھوں پر رکھ لیا۔

''لو دودھ پیو!''

اس نے جگ سے گرم گرم دودھ گلاس میں انڈیلا۔اور گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔

''مجھے دودھ نہیں پینا۔''اس نے رخ بدلتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

''بری بات ہے زرغونہ !دودھ خدا کا نور ہے۔اسے ٹھکرائیے نہیں ورنہ خدا رزق چھین لیتا ہے۔''سازینہ جانے کس سے سنا ہوا فلسفہ بگھار رہی تھی۔

''اس سے بڑی عنایت اور کیا ہو سکتی ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟بائی جی نے سن لیا تو........''

دھمکا رہی ہو مجھے ۔میں نہیں ڈرتی کسی بائی وائی سے ۔لے جاؤ اسے ۔منہ پر مارو اس کے ۔''اس نے گلاس پر ہاتھ مارتے ہوئے تلخی سے کہا۔

''زرغونہ !یہ بے جا ضد تمہیں ان لوگوں کی محبت سے بھی محروم کر دے گی جنہیں تمہارے ساتھ ہمدردی ہے۔''

''سنبھالو ایسی ہمدردی کو۔۔۔مجھے قطعی ضرورت نہیں۔چلی ہیں ہمدردیاں کرنے۔''۔۔اس نے بیزاری سے سازینہ کو دیکھا۔

جگ اور گلاس وہیں چھوڑ کر وہ باہر آ گئی ۔زرغونہ کی اس بات پر وہ تلملا اٹھی تھی ۔ نواب زادی کا مزاج ہی ٹھکانے نہیں ۔کوڑے کے ڈھیر پر خوشبو ڈھونڈتی پھرتی ہے ۔بائی جی نے چھوٹ دے رکھی تھی ۔تبھی دماغ آسمان سے باتیں کرتا ہے ہڈیاں جس دن گرم ہوئیں ہوش ٹھکانے آجائے گا۔''اس کی بڑبڑاہٹ میں زہر گھلا ہوا تھا۔

سرلا بائی کمرے میں آئی ۔اسے خود میں کھوئے بیٹھے دیکھا۔قریب آئی ۔شفقت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''زرغونہ لیٹ جاؤ۔تمہیں آرام کرنا چاہئے ۔بیٹھو نہیں۔''

لیکن نہ اس نے جواب دیا اور نہ آنکھ اٹھا کر دیکھا۔

''زرغونہ بیٹے کیا بات ہے؟ دودھ نہیں پیا۔لو پیو اسے ۔''اس نے دودھ سے بھرا گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

''پرے کرو اسے ۔کیا میرے سر پر چڑھائے چلی آرہی ہو۔''اس نے غصے سے کہا۔

''تمہیں اسے پینا چاہیے زرغونہ۔''

''کیوں؟اس نے ایسی نظروں سے سرلا بائی کو دیکھا۔جس میں کاٹ ہی کاٹ

تھی۔

چند ایک قریبی کوٹھے والیاں اس کی آمد کی اطلاع پا کر خبر پرسی لئے آئیں۔

''اچھی شادی رچائی زرغونہ تم نے؟''نفیسہ نے طنز کا گہرا وار کیا سرلا بائی کے تو دل پر لگا، مگر خاموش رہی۔

''بہت کمزور ہوگئی ہے۔''شہناز نے کہا۔

''مجھے تو نواب صاحب پر رحم آتا ہے کہتے ہوں گے۔

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند

شنو نے کہا۔دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا۔

سرلا بائی کسی کے پکارنے پر نیچے جا چکی تھی۔

''زرغونہ اب بیاہ کا کب ارادہ ہے؟''نفیسہ نے تمسخر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔نفیسہ اور شہناز نے اس سے باتیں کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔لیکن اس کے ہونٹ ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے چپکے رہے اور آنکھیں ٹکر ٹکر انہیں گھورتی رہیں۔

''کسی شبھ گھڑی میں تاریخ کا تعین کرنا چاہئے۔''

شہناز کی ماں نے کہا۔

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ چلی گئیں۔کمرہ خالی ہوگیا۔ان کی باتیں جلتے ہوئے شعلوں پر تیل ڈال گئی تھیں۔

''آہ تو کیا جیون ،موت تک یونہی ٹھوکریں کھاتا رہے گا۔''اس کی آنکھوں میں بے بسی کا سمندر امنڈا ہوا تھا۔

وہ کھڑی ہوگئی ۔اور کمرے میں دیوانہ وار ٹہلنے لگی ۔

لیکن چین کہاں تھا؟ چین تو اس کی زندگی سے کسی حرف غلط کی طرح رخصت ہو چکا تھا۔

''خدایا !تو جانتا ہے کہ معصومیت کے سینے پر لگا ہوا داغ کبھی نہیں دھویا گیا ۔اس گھر کی ہوائیں سازشوں میں مگن ہیں اور تو سویا ہوا ہے ۔میری دردبھری پکار بھی تجھے اس مدہوش نیند سے بیدار نہ کر سکی ۔تو کہاں ہے؟ کہاں ہے؟ میرے مالک !''

اس کے چہرے پر بجھی ہوئی چاندنی کی زردی تھی اور آنکھوں میں شفاف موتی ۔۔۔

''مصائب میں خدا کو پکاریئے ۔اس کی عبادت کیجئے ۔زندگی کی تلخیاں سکون آشنا ہو جائیں گی ۔''

مٹھاس میں ڈوبی ہوئی آواز کہیں قریب ہی سنائی دی۔

''آہ.....''

ہچکی اس کے لبوں پر بکھر گئی ۔

''خدا کی عبادت'' اس نے تڑپ کر سر اٹھایا اور دریچے سے باہر نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔

''کس خدا کی عبادت؟'' وہ بپھر اٹھی ۔

''جس نے زندگی کو جہنم بنا ڈالا ہے ۔ہر قدم پر زہر کے بھرے پیالے پینے کے لئے رکھ دیئے ہیں ۔میں نہیں مانتی کسی خدا کو ۔میرا کوئی خدا ہوتا تو میری دردبھری پکار نہ سنتا ۔'' باغیانہ خیالات ذہن میں سر اٹھا رہے تھے ۔

کوئی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا ۔جلدی سے اس نے آنسو صاف کئے اور بستر پر لیٹ

گئی۔

’’زرغونہ کیسی طبیعت ہے؟‘‘ممتاز اس پر جھکی ہوئی تھی۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔سرخ ہوئی آنکھیں دیکھتے ہی ممتاز کا چہرہ بگڑ گیا۔رسمی طور پر طبیعت کا ایک دوبار پوچھا تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہی اور پھر چلی گئی۔

گھر کے خادم آئے۔احوال پرسی کی اور آرام کرنے کا کہتے ہوئے چلے گئے۔

مقدر پر آنسو بہاتی وہ کچھ دیر بعد سوگئی۔

لیکن ممتاز بائی جاگ رہی تھی۔سرلا بائی جاگ رہی تھی۔ان کے ذہن سلگ رہے تھے۔کمرہ خاص میں دونوں زرغونہ کی عصمت نیلام کرنے کے خطرناک عزائم پر غور وخوض کر رہی تھیں۔

’’ہمیں فکر کرنے کی قطعی ضرورت نہیں سرلا! شکاری خود ہی شکار کرے گا۔‘‘

ممتاز بائی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اگلے چند دنوں میں ممتاز کا رویہ بیٹی کے ساتھ خلاف معمول بہت اچھا رہا۔ایک بار بھی اسے ناچ کمرے میں آکر رقص کرنے یا محفل میں بیٹھ کر گانا گانے کے لئے نہیں کہا گیا۔

ایسا لگتا تھا۔جیسے وہ ایک ٹوٹا پھوٹا خستہ مال ہو۔جسے اٹھا کر گھر کے کسی کونے کھدرے میں پھینک دیا گیا ہے۔

لیکن

وہ جانتی تھی۔

اسے کبھی نہیں بخشا جا سکتا۔

چند دنوں کے لئے جو آزاد چھوڑ دیا ہے۔وہ اس کی بیماری کی وجہ ہے۔

باب نمبر:۱۰

شب کا سیاہ آنچل دھرتی پر سایہ فگن ہے۔گہری اور تاریک رات اپنے دامن میں ستارے سمیٹے ہوئے ہے۔ستاروں کے چہروں پر جو روشنی ہے وہ اس سیاہی کو کم کرنے کی تگ ودو میں ہے۔مہذب دنیا خوابیدہ ہے لیکن ایک ایسی دنیا بھی ہے۔جو اس وقت بیدار ہے۔فضا کا سکوت مترنم آوازوں اور مدہوش کن سازوں سے لمحہ بلمحہ ٹوٹ رہا ہے۔مرمریں پیکر تھرک تھرک کر ہوش وخرد لوٹ رہے ہیں۔خوشبوؤں اور روشنیوں کا ایک طوفان امنڈا ہوا ہے۔

ممتاز بائی کا کوٹھا اس وقت سب سے زیادہ بارونق ہے۔محفل اپنے جوبن پر ہے۔رونق جان سازینہ کے نغمے اور نسرین کے رقص ہیں۔نواب داؤد ملحقہ کمرے میں تشریف فرما ہے۔اور ممتاز اس کے پہلو میں ہے۔

وہ بے کل ہے۔فرط مسرت سے دل سینے میں دھڑک دھڑک پڑتا ہے۔حواس پر سرور طاری ہے۔سیپی میں بند موتی سے کھیلنے کا خیال نشے کو دو آتشہ بنا رہا ہے۔

ممتاز بائی نے اسے زرغونہ کے متعلق مختصر الفاظ میں بتا دیا ہے۔اور اس نے جذبات کو اور بھی ہوا دے ڈالی ہے۔وقت کو تیزی سے گزرتے دیکھ کر وہ ممتاز بائی سے مخاطب ہوا۔

''ممتاز !بخدا اب ضبط کا یارا نہیں ۔ہم دیدار محبوب کے لیے بے چین ہیں۔''

اس کے بے پایاں شوق و تجسس پر ممتاز بائی ادائے ناز سے مسکرائی ۔کافرادا سے اسے دیکھا اور بولی۔

''حوصلہ رکھیے۔''

''نہیں ممتاز اب ضبط کا یارا نہیں ۔انتظار کی کٹھن ساعتوں کو ختم کردو۔''

دل والے تو کہتے ہیں کہ انتظار میں زمانے بھر کا حسن پنہاں ہے عالی جاہ !مخمور نگاہوں سے ممتاز بائی نے اسے دیکھا۔

''یہ سچ ہے ممتاز !لیکن فیصلہ کرو ۔کیا میں نے اس حسن کا ستم نہیں سہا ہے ۔ذرا وقت تو دیکھو!''

''مجھے احساس ہے۔'' وہ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کھڑی ہوگئی ۔اور کسی سبک سر لہر کی طرح لہراتی بل کھاتی باہر نکل گئی ۔تھوڑی دیر بعد دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔

محفل برخاست ہونے ہی والی ہے۔

مسکراتے ہوئے وہ ایک بار پھر اس کے پہلو میں بیٹھ چکی تھی۔ممتاز بائی کی ناسازی طبع کا کہتے ہوئے لوگوں کو چلے جانے کو کہا گیا ۔بادل ناخواستہ لوگ اٹھے اور اپنی اپنی راہوں پر چل دیے ۔برآمدے کی روشنیاں گل کر دی گئیں اور چقیں گرا دی گئیں ۔یہ گویا کاروبار بند ہونے کی علامت تھی۔

کچھ دیر بعد سکون ہوگیا اور وہ ممتاز کے ہمراہ زرغونہ کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے اپنا سانس پھولتا ہوا محسوس ہوا۔ تنفس کی تیزی کے پیش نظر اسے اپنا ہاتھ سینے پر رکھنا پڑا۔ آنکھوں میں شوق و مسرت اور خوف و ہراس کے ملے جلے رنگ گھل رہے تھے۔

یہ طوائف کا کوٹھا تھا۔

''یہاں آنکھوں میں خوف و ہراس کیسا؟''

لیکن زرغونہ کا منفرد کردار ہی شاید اس خوف کا سبب تھا۔ بائیں ہمہ آتش شوق بھی خوب فروزاں تھی۔ آنکھوں میں ہوس کے سرخ سرخ ناچتے شعلے پوری شدت سے دہک رہے تھے۔

زرغونہ کے کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھولا گیا۔ شام کو وہ نہائی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کھلے سیاہ چمک دار گیسورات کی سیاہی کی مانند تکیے پر بکھرے پڑے تھے۔ اور ان کے درمیان اس کا دلفریب چہرہ چمک رہا تھا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ شب خوابی کے لباس میں جسمانی نشیب و فراز بے طرح نمایاں ہو رہے تھے۔

نواب داؤد مرقع حیرت بنا اس کے چہرے پر پھیلے معصومیت کے نور کو دیکھ رہا تھا۔ جو کمرے کی مدھم مدھم روشنی کو ماند کر رہا تھا۔ اس پر انسان نہیں۔ صانع قدرت کے کسی انوکھے شاہکار کا گمان گزر رہا تھا۔

وہ اس میدان کا نیا شہسوار نہ تھا۔ تجربہ کار اور شاطر کھلاڑی تھا۔ پھولوں کو روندتے مسلتے اور توڑ موڑ کر ان کی پتیاں بکھیرتے ایک عمر گزری تھی۔

لیکن اس تاریکی میں جلتا یہ دیا تو کسی اور ہی دنیا کا پتہ دے رہا تھا۔

ممتاز بائی پلنگ کے نزدیک دلگیری کھڑی تھی۔ اعصاب پر جانا پہچانا سا خوف

طاری تھا۔آنکھیں اندرونی درد کی واضح انداز میں عکاسی کر رہی تھیں۔

''زرغونہ !''

دل کا درد دھیمی دھیمی سرگوشیوں میں ڈھل گیا۔

''تم طوائف کی بیٹی ہو کر ان روایات کو توڑنے کے درپے ہو جو یہاں کی ریت ہیں۔یہاں بیٹھ کر تم وہ چیز خریدنے کی متمنی ہو۔جو یہاں خریدی نہیں بیچی جاتی ہے۔کاش تم خود کو اس سانچے میں ڈھال لیتیں۔تو یہ سودا زبردستی نہ ہوتا اور میں نواب داؤد کے ہمراہ سہمے سہمے قدم اٹھاتی یوں چوروں کی طرح تمہارے کمرے میں داخل نہ ہوتی۔

زرغونہ طوائف جذباتی لہروں سے کبھی نہیں کھیلا کرتی۔اور نہ کبھی تخیلی ساحل تعمیر کرتی ہے۔اس لئے کہ جذباتی موجیں حقائق سے دور لے جاتی ہیں۔اور ریتیلے ساحل آناً فاناً ٹوٹ جاتے ہیں۔

آنسو رخساروں پر بہنے کے لئے مچلے لیکن اس نے انہیں آنکھوں میں ہی جذب کر لیا۔

نواب داؤد کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر آ گئی۔

دروازہ بند کرتے ہوئے نواب داؤد کو محسوس ہوا کہ اس کے ہاتھ لرز رہے ہیں،خود پر قابو پایا اور قدم بڑھا کر قریب آ گیا۔

جھکا۔۔۔زرغونہ کے سانس کی تیزی کی تپش چہرے سے ٹکرائی۔سانس اس کے جسم کی طرح مہکا ہوا تھا۔جذبات کی دنیا میں کہرام مچ گیا۔خون کی گردش تیز ہو گئی۔ہاتھ سرعت سے آگے بڑھے اور اس کے رخساروں سے چپک گئے۔

''جانِ من آنکھیں کھولو۔''

آواز جذبات سے بوجھل تھی۔

''نیند میں ڈوبے جسم کو دباؤ کا احساس ہوا۔مخمور نگاہیں کھلیں اور خود پر کسی کو جھکا دیکھ کر خطرناک حد تک پھیل گئیں۔

''اف اتنی حسین آنکھیں ۔''اس نے لمبی سانس بھری۔

صورتحال کو زرغونہ نے فوراً بھانپ لیا تھا۔ہاتھوں کو تیزی سے جھٹکتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔جوشِ غضب سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''پیچھے ہٹاؤ ان منحوس ہاتھوں کو۔''

وہ کسی وحشی چیتے کی طرح غرائی۔۔۔۔غصے سے اس کا سارا بدن لرز رہا تھا۔

نواب داؤد والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

''ہٹ جاؤ ذلیل انسان تم اس وقت میرے کمرے میں کیا کرنے آئے ہو؟''

وہ ایک ہی جست میں پلنگ سے فرش پر تھی۔اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔تنفس کی تیزی عروج پر تھی۔

''یہ سوال ایک شریف زادی کو زیب دیتا ہے،طوائف کو نہیں۔'' نشے سے جھومتے ہوئے وہ طنزیہ ہنسی ہنسا۔

زخمی سانپ کی طرح وہ پھنکاری۔جسم اور ہاتھوں میں فولادی قوت محسوس ہوئی۔کچکچاتے دانتوں سے وہ اس کی طرف بڑھی اور اگلے ہی لمحے نازک ہاتھ بھرپور قوت سے نواب داؤد کے رخسار پر تھا۔

''تمہاری دنیا کی شریف زادیوں کے چہروں پر تو پاکیزگی کی مہریں ثبت ہیں نا۔''

الفاظ میں تلوار کی سی کاٹ تھی۔

رخسار پر پڑا ہوا تھپڑ نواب داؤد کو ہوش کی دنیا میں لے آیا۔نشہ اڑتا ہوا محسوس ہوا۔ایک نواب کی توہین اور وہ بھی ایک طوائف زادی کے ہاتھوں۔۔۔

نوابی خون رگوں میں کھول اٹھا۔

زہر آلود نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے وہ اس کی طرف لپکا۔

''اس بازار میں بیٹھ کر اتنا زعم!'' اسے بازو سے پکڑ کے اس نے ایک جھٹکا دیا۔

''چھوڑو مجھے ذلیل کتے!''

زرغونہ نے نوکیلے لمبے ناخنوں سے نواب کا چہرہ نوچ ڈالا۔ بازو کو دانتوں سے اس زور سے کاٹا کہ شدت درد سے وہ بلبلا اٹھا۔ اضطراری حالت میں اسے چھوڑ کر اپنا کندھا مسلنے لگا۔

گرفت سے آزاد ہوتے ہی اس کی وحشی نگاہیں کسی چیز کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکیں۔ لیکن وہ کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کسی ایسی چیز کو نہ دیکھ سکی۔

جو اس کے لئے ایسے وقت میں مدافعتی سہارا بن سکتی۔ سرلا بائی اس کی عدم موجودگی میں ایسی ہر چیز کو ہٹا چکی تھی۔

''اپنی ماں کی طرح آؤ اور میرے گلے لگ جاؤ تمہاری عافیت اسی میں ہے۔ ورنہ ابھی تمہاری اس پارسائی کی دھجیاں بکھر جائیں گی۔''

''ہوش میں رہ کر بات کرو۔ تمہاری مخاطب ممتاز بائی نہیں، زرغونہ ہے۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔ تم تو آب زلال کا وہ گھونٹ ہو جس کو پیتے ہی روح کی ازلی تشنگی دور ہو جائے گی۔''

وہ نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتا ہوا اور آگے بڑھا۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ پیچھے ہٹی۔ ایک دفعہ پھر نظریں کمرے میں دوڑائیں۔ اور اگلے لمحے اس کا نازک ہاتھ الماری کے شیشے پر تھا۔ تیز چھناکا ہوا اور شیشہ ٹوٹ گیا۔ مشینی انداز میں اس نے شیشے کے ٹکڑوں کو ہاتھ میں پکڑا اور خوفناک لب ولہجہ میں بولی۔

''آگے بڑھتے ہوئے اپنے انجام کو مدنظر رکھنا۔''

لیکن نواب داؤد پر تو اسکی قربت کا نشہ سوار تھا۔قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ شیشے کا نوکیلا ٹکڑا پیشانی پر لگا۔دوسرا ٹکڑا رخسار پر اور پھر تو اسے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے کسی آسمانی بلا نے گھیر لیا ہے۔مدافعت کی کوشش کی لیکن بے سود۔

''خیریت چاہتے ہو تو چٹخنی کھول کر باہر چلے جاؤ۔ورنہ صبح تمہاری لاش یہاں سے اٹھانی پڑے گی۔''

اس نے دوسرا شیشہ دوسرے ہاتھ سے توڑتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔

گرم گرم تازہ خون کی ندیاں تھیں جو اس کے چہرے سے بہہ بہہ کر اس کی شکل کو اور زیادہ مہیب اور ڈراونی بنا رہی تھیں۔خون کے اخراج سے نقاہت طاری ہو رہی تھی۔جی چاہ رہا تھا کہ اسے اٹھا کر دریچے کی راہ سے گلی میں پھینک دے۔لیکن وہ لڑکی نہیں کوئی خبیث روح معلوم ہو رہی تھی۔عافیت دروازہ کھولنے میں ہی نظر آئی۔جن لرزتے ہاتھوں سے چٹخنی اوپر چڑھائی تھی۔انہی سے نیچے گرائی گئی۔دروازہ کھولا اور اس کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اس نے فوراً دروازہ بند کر لیا۔اور کسی تھکے ہارے انسان کی طرح اپنی پشت دیوار سے ٹکائی اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔اندوہ گین احساسات کے طوفان میں گھرے ہوئے اسے اس درد کا بالکل احساس نہ ہوا۔جو ہاتھوں میں شیشے توڑنے کی وجہ سے ہو رہا تھا۔

دل کا درد کم تھا۔

تازہ خون رس رس کر بہہ رہا تھا۔کپڑے خون سے رنگے جا رہے تھے اور وہ حزن و یاس کے گہرے سایوں میں بے خود بکھرے بالوں کے ساتھ کسی پاگل انسان کی طرح

کھڑی تھی۔سر کو کتنی بار دیوار سے ٹکرایا۔آنکھیں کتنی بار بند ہوئیں اور کتنی بار کھلیں۔

خوفناک سا ایک خیال دماغ کے کسی کونے سے رینگ کر باہر آیا۔تیزی سے چلتے ہوئے وہ کھڑکی تک پہنچ گئی۔پردہ سرکا کر باہر گلی میں دیکھا۔کچھ اندازہ لگایا کچھ سوچتی رہی۔اور پھر جھکی۔

ریلنگ کو پکڑ کر دھڑ باہر کیا۔

''زندگی خدا کی مقدس امانت ہے۔خودکشی جیسے مذموم فعل سے ہم اسے ختم کرنے کے مجاز نہیں۔''

سرسراتی ہواؤں نے سرگوشی کی۔

تڑپ کر اسنے ریلنگ پر جھکے نصف دھڑ کو اندر کر لیا۔لوہے کے راڈوں پر ہاتھوں کی گرفت سخت ہوگئی۔سسکیاں لیتے ہوئے اس نے سر کو راڈ پر کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح رکھ دیا۔

خدا کی عبادت کیجئے۔اسے پکاریئے۔زندگی کی تلخیاں سکون آشنا ہو جائیں گی۔

دو روشن آنکھیں اس کی آنکھوں پر جھک آئیں۔اپنائیت میں ڈوبی ہوئی آواز دل سے اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

سامنے والے گھر سے کسی نئی مغنیہ کی بھاری آواز کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ساز چیخ رہے تھے۔

سر جھٹکتے ہوئے وہ تند لہجے میں خود سے بولی۔

''کس خدا کی عبادت؟''

اس خدا کی عبادت جسے زمین کے باسیوں کا کوئی خیال نہیں۔وہ خدا جو اپنی دنیا میں مگن ہے۔میں کسی خدا کو نہیں مانتی۔میرا کوئی خدا نہیں۔

وہ خون آلود ہاتھوں سے آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو تیزی سے صاف کرتے ہوئے ہذیانی انداز میں بولے جا رہی تھی۔

باب نمبر:11

ممتاز بائی! تمہاری ان حسین آنکھوں سے ٹپکتا اظہار تاسف عنابی ہونٹوں سے نکلتے درد بھرے الفاظ اور مرمریں ہاتھوں کے پیار بھرے لمس نے میرے رستے ہوئے زخموں پر سکون کے پھاہے رکھ دیئے ہیں۔یہ تم ہو ممتاز بائی !جس کی بیٹی کے ہاتھوں پٹ جانے کے باوجود بھی ہم خاموش ہیں۔وگرنہ ہمارا ایک اشارہ تمہاری شان وشوکت کو ملیا میٹ کرسکتا ہے۔تمہارے وقار کے پرخچے اڑا سکتا ہے۔اوراس بازار میں تمہاری ساکھ کو ختم کرسکتا ہے۔

پٹیاں بندھے چہرے کو تکیے پر رکھے نواب داؤد ممتاز کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں پکڑے دھیمی دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔

''آپ جیسے بلند ظرف انسان سے مجھے اسی سلوک کی توقع ہے۔

عالی جاہ! میں صبح کے انتظار میں ہوں تا کہ اس سرکش لڑکی کو کیفر کردار تک پہنچا سکوں۔علی جاہ بیٹی مجھے آپ جیسے قدردان اور مہربان سے زیادہ عزیز نہیں۔آپ کی محبت پر بیٹی تو کیا دنیا کی ہر چیز قربان کی جاسکتی ہے۔کاش عالی جاہ !آپ ایک بار میرے دل کی

گہرائیوں میں جھانک کر دیکھ سکتے۔''

ممتاز بائی کی انگلیاں نواب داؤد کے بالوں سے کھیل رہی تھیں۔اور ان شریں بولوں سے وہ اس کے دل پر لگے ان چرکوں کو مندمل کرنا چاہتی تھی۔

''ہم جانتے ہیں ممتاز ! ہمیں تمہاری محبت اور چاہت کا بخوبی احساس ہے،تم سوچ سکتی ہو کہ ہمارے ہاتھوں میں مجبوری کی یہ بیڑیاں کس نے پہنائی ہیں؟''

اس نے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''تمہارا مستقبل بہت تاریک ہے۔''

''سرکار ! میں آپ کو کیا بتاؤں ؟ یہ غم مجھے جونک کی طرح کھائے جا رہا ہے۔''اس نے دردناک لہجے میں کہا۔

''ممتاز ہمارے اس درد کا علاج کون کرے گا؟''

''گھبرایئے نہیں حضور !یہ زخم آپ کو ہم سے ملے ہیں۔اور ان پر مرہم بھی ہم ہی رکھیں گے۔''

''جان من انہیں تمہارے ہاتھوں کی نہیں زرغونہ کے نازک ہاتھوں کے لمس کی ضرورت ہے۔''

''میں سمجھتی ہوں!''

''سپیدہ سحر نمودار ہونے کو ہے۔ہمیں اب رخصت ہو جانا چاہیے۔''

نواب نے لمبی سانس بھری اور حسرت ناک لہجے میں بولا۔

''آہ پھول چننے کی امید پر آئے تھے۔لیکن کانٹے ساتھ لئے جا رہے ہیں۔''

''میرا دل ڈوب رہا ہے سرکار!خدا کے لئے آپ ایسی باتیں نہ کیجئے۔زرغونہ نے جلتے دیئے بجھانے کی کوشش کی ہے۔اور یہ کوشش اسے بہت مہنگی پڑے گی۔وہ آپ

کے قدموں تلے نہ بچھا دی گئی۔ تو ممتاز نام نہیں۔۔۔۔"

''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کے اندر کوئی خبیث روح حلول کر گئی ہے۔وہ دھان پان سی لڑکی نہیں۔شیرنی معلوم ہو رہی تھی۔''

''ممتاز بائی ! ہم تمہیں بھی الزام دیں گے۔اگر وہ شروع بچپن ہی سے ایسی تھی۔تو تم نے اسے نظر انداز کیوں کیا؟''

ممتاز بائی خاموش رہی۔جواب کیا دیتی۔

''تم نے کیا سوچا ہے؟''نواب نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔

''میں اسے لے کر قدم بوسی کے لئے خود حاضری دوں گی۔آپ کو یہاں آنے کی زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔"

''لیکن کب تک؟''

''بہت جلدی عالی جاہ!''چار بجے نواب داؤ دچلا گیا۔

ضبط کا وہ بند جو اس کی موجودگی میں مضبوطی سے بندھا تھا۔ایک پل میں ٹوٹ گیا۔اور وہ کسی ضدی بچے کی طرح بلک بلک کر رو دی۔

سرلا بائی کمرے میں داخل ہوئی۔ناشتے کی ٹرے میز پر رکھی۔چائے بنائی اور کپ اٹھائے اس کی طرف بڑھی۔ممتاز۔لیکن وہاں پکار کا کوئی جواب نہ پا کر پریشان ہوئی روشن اور چمکدار چہرہ آنسوؤں کی لکیروں اور تفکر کی گرد سے اٹا پڑا تھا۔

''ممتاز'' سرلا بائی نے اسے کندھوں سے جھنجھوڑا۔

لیکن وہ اپنے حواسوں میں کب تھی؟ گم صم اس اندھیری دنیا کے قلب میں جھانک رہی تھی۔جہاں ارمانوں کی خاک اڑ رہی تھی تمناؤں کے بگولے ناچ رہے تھے۔اور حسین امیدیں مایوسیوں کے پیرہن پہنے منہ ڈھانپے رو رہی تھیں۔

''سرلا ! اس حادثے کا اگر چرچا ہوگیا تو نواب داؤد کو ورغلانے کی کوشش کی جائے گی۔مجھے بتاؤ۔اب کیا ہونا چاہئے؟''

وہ رو دینے کو تھی۔

''تمہیں کیا ہورہا ہے؟سوائے جگو اور نھی کے کسی کو بھی علم نہیں۔اور تم اچھی طرح جانتی ہو وہ قابل اعتماد ملازم ہیں۔''

''میرا ذہن ماؤف ہورہا ہے۔مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔سوچو تو سہی اگر نواب داؤد دل برداشتہ ہوکر کہیں اور پناہ لے بیٹھا تو کیا ہوگا؟سرلا یہ میری توہین ہوگی۔یہ اس کوٹھے کی توہین ہوگی۔جانتی ہو نا کہ میں نے آج تک امراء اور روسا کو اس کوٹھے کے علاوہ کسی اور طرف منہ نہیں کرنے دیا۔لیکن اب کیا ہوگا؟''

اس نے سر گھٹنوں میں چھپاتے ہوئے دردناک آواز میں کہا۔اور چند ہی لمحوں بعد سر اٹھاتے ہوئے جنونی انداز میں چیخی۔

''حرام زادی سویروں کی متمنی ہے۔سور کی اولاد اجالوں کو گلے لگانا چاہتی ہے۔۔۔لیکن کتیا یہ بھول گئی ہے۔یکسر بھول گئی ہے کہ اس نے اندھیروں میں جنم لیا تاریکیوں میں پروان چڑھی ہے اور سیاہیاں اس کا مقدر ہیں۔''

وہ پاگلوں کی طرح کمرے میں ٹہل رہی تھی۔

''اسے عقبی کمرے میں پہنچاؤ سرلا!اسے وہی سزا دی جائے گی جو اس بازار کی ریت ہے۔اس ازلی و ابدی حقیقت سے منہ موڑنے والی لڑکیوں کو دی جاتی ہے۔''

وہ دھاڑی۔

عقبی کمرے میں پہنچانے کا سنتے ہی سرلا بائی سہم گئی۔

''نہیں ممتاز ابھی ٹھہرو۔مجھے ایک بار پھر موقع دو۔وہ تمہاری سزا کی متحمل نہ

ہو سکے گی ۔وہ مر جائے گی ۔ممتاز !''

''وہ مر جائے گی تو اس سے بڑھ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے سرلا !میں نے جو کچھ کہہ دیا ہے وہ حرف آخر ہے ۔اسے اب میرے ہاتھ لگیں گے اور میں دیکھوں گی کہ اس کا بگڑا ہوا دماغ کیسے نہ درست ہو گا۔''

''ممتاز !ایک بار اور کوشش کرنے دو۔''سرلا بائی نے منت کرتے ہوئے کہا۔

''سرلا !حرام کی تخم میرے منہ نہ لگو۔۔۔۔جاؤ اور میں نے جو کہہ دیا ہے اس پر عمل کرو۔''

خاموشی سے سر جھکائے وہ کمرے سے نکل گئی ۔ممتاز بائی کی کڑک دار آواز نے اسے بھی دہلا ڈالا تھا۔

زرغونہ کے دروازے پر اس نے آہستگی سے دستک دی۔

کچی کچی نیند کا غبار زرغونہ پر چھایا ہوا تھا۔دستک کی آواز سن کر اس نے آنکھیں کھولیں۔اور دروازہ کھول دیا۔سرلا بائی کے سینے میں اسے دیکھتے ہی درد کی لہر اٹھی ۔اس کی آنکھوں میں جیسے زندگی ہاری ہوئی نظر آتی تھی۔پپوٹے شدت گریہ سے متورم تھے اور سفید گلابی چہرے پر جا بجا خون کے دھبے اس کی حرماں نصیبی کا ماتم کر رہے تھے۔

زرغونہ سے اسے قلبی پیار تھا۔اس کی پرورش بہت حد تک اس نے کی تھی۔گو کہ عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کے لئے زرغونہ ایک ایسی شکستہ عمارت تھی جس پر کسی طرح بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔لیکن پھر بھی اس ضدی لڑکی سے اسے بے پایاں محبت تھی۔

لیکن ممتاز بائی کے اس حکم کو ٹالنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔مغموم آواز میں اس نے زرغونہ کو عقبی کمرے میں پہنچنے کے لئے کہا۔اور خود رخ پلٹ کر تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔

عقبی کمرے میں پہنچنے کا مطلب زرغونہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔شبو اسی بھٹی میں جل جل کر کندن بنی تھی۔

''جرم بھی سنگین ہے۔لہٰذا سزا بھی سنگین ہی ہونی چاہیے۔''وہ خود کو بہلاتے ہوئے آئینے میں اپنے عکس سے مخاطب ہوئی۔

ملحقہ باتھ روم میں جا کر اس نے منہ ہاتھ دھویا۔بالوں میں کنگھی کی چہرے پر بشاشت لانے کی پوری کوشش کی۔وہ ماں کے سامنے کمزوری کے اظہار کو اپنی توہین سمجھتی تھی۔

''خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں زرغونہ !''وہ خود سے مخاطب ہوئی۔

''یہ راستہ اگر چلنے کے لئے منتخب کیا گیا ہے تو صعوبتوں اور سختیوں سے خوف زدہ ہونا کیسا؟یہ کڑا اور پتھریلا راستہ ہے۔اس راستے پر پھول نہیں کانٹے ہی کانٹے بکھرے ہوئے ہیں۔کانٹے چبھیں گے تو خون رسنا ہی ہے۔''

پروقار چال سے چلتی ہوئی وہ عقبی کمرے میں پہنچ گئی۔

ممتاز بائی پھنکاریں مارتی کمرے میں آئی۔تیور بگڑے ہوئے تھے ماں بیٹی کی نگاہیں ایک پل کے لئے ملیں اور زرغونہ کے چہرے پر غایت سکون وطمانیت دیکھتے ہی وہ جل اٹھی۔تن بدن میں شعلے بھڑک اٹھے۔رگیں تن گئیں۔اور چہرے پر کرختگی ابھر آئی۔

اونگھتی ممتا دل کے آخری گوشے میں سمٹ کر گہری نیند سوگئی۔

''حرام زادی!بازار میں بیٹھ کر یہ پارسائی کس کو دکھاتی ہے؟کون ہے تیرا یار یہاں جو اسے دیکھے اور سراہے گا۔''

''گالیاں دینے کی ضرورت نہیں۔تم نے جس کام کے لئے مجھے بلایا ہے وہ کرو۔''اس نے نفرت سے ماں کو دیکھا۔اور بے خوف آواز میں بولی۔

لوہے کی موٹی سلاخ جو اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی گھما کر اس کی پیٹھ پر ماری۔ایک چیخ زرغونہ کے منہ سے نکلی اور وہ فرش پر گر گئی۔سلاخ زمین پر پھینکتے ہوئے اس نے زرغونہ کا بازو پکڑ کر چہرہ سیدھا کیا۔اور جوتی کی نوک سے اس کی ٹھوڑی کو ٹھوکر مارتے ہوئے چیخی۔

''حرام زادی ! اپنی اس لاش کو دیکھو۔یہ لاش حرام کا کھا کھا کر اتنی بڑی ہوئی ہے۔اپنے وجود کی حقیقت پر غور کرو۔یہ حرام کاری سے معرض وجود میں آیا ہے۔میرے ہی سامنے مٹتی ہو۔یہ پارسائی میرے اوپر ہی آزماتی ہو؟''

جانے کہاں سے اتنی جرات اس میں آ گئی۔بڑھتے ہوئے پاؤں کو اس نے ایسا شدید جھٹکا دیا کہ ممتاز بائی اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔اور لڑکھڑا کر گر پڑی۔

اور پھر تو ایک طوفان تھا جو امنڈ آیا۔اندھا دھند سلاخوں کی بارش ہونے لگی۔شاید وہ اسے یونہی مار ڈالتی کہ سرلا بائی نے تیزی سے آ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''یہ غلط طریقہ ہے ممتاز کیا اسے مار ڈالنا چاہتی ہو؟''

ایک دھکا اس نے سرلا کو دیا اور وہ دور جا گری۔لیکن اب استاد لوگ بھی آ گئے۔سلاخ اس کے ہاتھ سے چھین لی گئی۔

''بائی جی قاعدے کی سزا دیں۔''بڑے استاد نے عاجزی سے کہا۔

''تم نے اس کے کرتوت نہیں دیکھے۔میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔آج اس کا جنازہ اٹھے گا۔''

''غصہ انسان کو خراب کرتا ہے بائی جی ! کچھ سوچیے۔''

''بخش دیں یہ حرام زادی کیوں میرے لیے روگ بنتی جا رہی ہے یہ اپنے کس یار کے پاس جانا چاہتی ہے۔بتاتی کیوں نہیں۔سمجھتی ہے بازار سے باہر دنیا اسے آنکھوں پر

بٹھائے گی ۔ نکلے نہ ذرا یہاں سے ۔کون منہ لگائے گا اس کتیا کو، جوایک طوائف کی اولاد ہے ۔معاشرہ اس کے لئے اپنے میں بال برابر گنجائش نہیں نکال سکتا ۔ یہ اس دنیا میں جانا چاہتی ہے جہاں کی پارسا عورتیں ہمیں بھی مات کر رہی ہیں ۔ ہم تو گناہ کرتے ہیں ڈنکے کی چوٹ پر ۔جسم بیچتے ہیں تو اعلانیہ ۔لیکن وہاں شرافت کی اوٹ میں کھیل کھیلے جاتے ہیں ۔بازار کا دھندا کیوں مندا پڑ رہا ہے بخش دین ۔اس لیے کہ اب پارسا لوگوں کی بہو بیٹیوں نے بھی یہی کھیل کھیلنے شروع کر دیئے ہیں ۔ہمیں کہا جاتا ہے طوائف ۔

مجھ سے سوال کئے جاتے ہیں اس کا باپ کون تھا ۔ یہ تو گندا انڈا نکل آیا ۔وہ جو باہر گندے انڈے پھرتے ہیں ۔وہ کن کے ہیں؟ انہیں نیک اور پرہیز گار لوگوں نے جنم دیا ہے ۔پھر وہ کیوں کتوں کی طرح پھر رہے ہیں ۔ یہ اجالوں میں جانا چاہتی ہے ۔ جہاں گھپ اندھیرے ہیں ۔بخش دین ۔اس جیسا ذہن رکھنے والی لڑکیاں نہ گھر کی رہتی ہیں، نہ گھاٹ کی ۔''

اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی ۔

''چھوڑو بائی جی !ہم کیا نہیں جانتے ۔یہاں سے جولڑ کی بھی نکل کر گئی ۔اس نے سکھ کا سانس نہیں لیا ۔تم خود کو ہلکان نہ کرو ۔میرا خیال ہے ۔اب یہ ٹھیک ہو جائے گی ۔''

''نہیں بخش دین ۔یہ معاملہ آج آر ہو گا یا پار ۔میں اس روز روز کی کل کل کو ختم کر دینا چاہتی ہوں ۔یہ سرکشی پر اتری ہوئی ہے ۔اس نے نواب داؤد کے ساتھ وہ سلوک کیا ہے ۔جو آج تک بازار کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا ۔یہ دیوثی معلوم ہوتی ہے دیوثی ۔۔۔جانے کس منحوس گھڑی میں نے اسے جنم دیا تھا ۔تم سلاخیں گرم کرو ۔''

اس نے گرجتے ہوئے حکم دیا ۔

''مر جائے گی بائی جی !میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں ۔''استاد نے منت کرتے

ہوئے کہا۔

''اچھا ہے پاپ کٹے گا۔اس جیسی نیک پرہیز گار لڑکیاں ہمیں نہیں چاہئیں۔یہ اسی دنیا کے قابل ہیں۔جہاں ان کے ایک جوتی اوپر اور ایک نیچے ہوتی ہے۔''

''زرغونہ !تم معافی مانگ لو۔کہہ دو کہ میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔''

دبلی پتلی کا نٹی سی لڑکی ،ادھ موئی ہو چکی تھی۔کانوں میں استاد کی آواز پڑی معلوم نہیں کیسے کہا۔سننے والوں نے سنا کہ وہ کہہ رہی تھی۔

''فیصلے صرف ،ایک بار ہی ہوتے ہیں۔تمہاری دنیا سے سمجھوتہ کرنے کے لئے میرا دل و دماغ آمادہ نہیں۔''

''ہوں !دیکھا تم نے۔رسی جل جائے گی لیکن بل نہیں جائے گا۔چھوڑ و بخش دیں۔''

''تمہارا دل و دماغ۔تمہارا لطیف مزاج سبھی درست ہوں گے۔تمہیں سیدھا نہ کردیا گیا۔تو ممتاز بائی نام نہیں۔ان ہاتھوں نے کیا نہیں کیا؟ یہاں نشو اور نمی سرکش لڑکیاں پگھل کر موم ہوگئیں۔''زرغونہ نے ایک بار آنکھیں کھولیں۔اپنے سامنے کھڑی جلاد عورت کو دیکھا۔

ایک نظر ---

صرف ایک نظر ---

اور وہ نظر ---ممتاز بائی سے کہہ گئی تھی۔

''زرغونہ کو مرغوب کرنے کا ہر حربہ ناکام ہوگا۔''

سازینہ کو آواز دی گئی۔

آگ کی طرح سرخ ،لوہے کی سلاخیں چھوٹے استاد کے ہاتھوں سے ممتاز بائی

کے ہاتھوں میں پہنچ گئیں ۔اوراس کے بعداس کی ننگی پیٹھ پر چپک گئیں ۔

باب نمبر:۱۲

آفتاب کی رو پہلی کرنیں دریچے کی جالی سے چھن چھن کر دبیز سادہ قالین پر گل بوٹے بنا رہی تھیں۔کمرے میں ہر طرف اجالا اور روشنی بکھری ہوئی تھی۔ماحول سکون بخش تھا۔لیکن ممتاز بائی کو کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا۔جیسے وہ ایک لق و دق صحرا میں کھڑی ہو۔جہاں تند ہواؤں سے اڑتے ہوئے ریت کے گرم ذرات آنکھوں میں گھسے چلے جا رہے ہوں۔اور وہ جلتے زخمی پاؤں سے کسی سایہ دار درخت کی تلاش میں سرگرداں ہو۔

''آہ!''اس کے ہونٹ ہلکے ہلکے تھرتھرائے۔

''تمہاری ذات میں مستقبل کا تحفظ ایک سراب نہیں تو کیا ہے؟ زرغونہ تمہارے وجود سے وابستہ وہ دل خوش کن امیدیں سنہری خواب اور حسین تصوارت بھیانک راتوں کے اندھیروں میں بدل گئے ہیں۔مایوسیوں اور ویرانیوں کے مہیب غار منہ پھاڑے کھڑے ہیں۔ان کے دامن میں جھانکتے ہوئے میرا ذہنی توازن بگڑ رہا ہے میں یہ صدمہ نہ سہہ سکوں گی۔۔۔میں پاگل ہو جاؤں۔۔۔پاگل ہو جاؤں گی۔۔۔

خدا تجھے کبھی سکون نہ دے زرغونہ ! جس طرح تو نے مجھے تڑپایا ہے ۔قدرت تجھے تڑپائے ۔''

اس کی نگاہوں میں شعلے تھے اور چہرے پر یاس کے گہرے سائے ۔

دکھی نگاہیں کمرے میں ادھر ادھر گھومیں ۔

ذہن بھٹکا ۔

سر دیوار سے ٹکراتے ہوئے اس نے خود سے کہا ۔

''ایک طوائف جب اجالوں کی تمنا کرتی ہے ۔روشنیوں کی تلاش میں بھاگتی ہے ۔تو وہ کہیں کی نہیں رہتی ۔معاشرے کا دامن سکڑ جاتا ہے ۔اور بازارِ حسن اس پر اعتماد کرنا چھوڑ دیتا ہے ۔زرغونہ میں یہ سب تمہیں کیسے سمجھاؤں؟''

گوری گوری ننگی پیٹھ سے نکلتی چربی آنکھوں کے سامنے آئی ۔گوشت جلنے کی ہمک ناک نے محسوس کی ،دل کے کسی گوشے میں سوئی ہوئی ممتا نے آنکھیں کھولیں ۔

پشیمانی کا خفیف سا احساس ہوا ۔ممتا کو شہہ ملی ۔ہاتھ پاؤں ادھر ادھر پھیلنے لگے ۔دل کی دنیا قریب تھی کہ اس گھیرے میں سمٹ آتی کہ پیشہ وارنہ احساسات پھن لہرا کر اٹھے اور آناً فاناً وہاں ممتا زبائی کسی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی ۔

''باغی کے لئے رحم کے جذبات رکھنا اس بازار کی ریت نہیں ۔''اس نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے خود سے کہا ۔

ذہنی کھچاؤ نقطہ عروج پر پہنچ گیا تھا ۔

وہ غم کے اس حصار سے باہر نکل جانا چاہتی تھی ۔وہ اس وقت سکون کی متمنی تھی ۔

تکیے پر سر رکھتے ہوئے اس نے آنکھیں موندلیں تھوڑی دیر تک اضطرابی موجیں ذہنی سمندر میں بپھرتی رہیں ۔خوفناک شور کے ساتھ ٹکراتی رہیں ۔

لیکن بالآخر تھکاوٹ نے غنودگی طاری کر دی۔

رات کے آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ تھی۔ تھا تھی، کی آوازوں سے سمجھ گئی استاد لوگ اور سازینہ ٹائم لگانے والے کمرے میں پہنچ گئے ہیں۔

سازینہ کا خیال آتے ہی کلیجہ منہ کو آ گیا۔

اپنی کوکھ سے جنم دی ہوئی اولاد سے کیا وہ بہتر نہیں۔ جس کا میرے ساتھ بظاہر کوئی تعلق نہیں۔ لیکن جو میرے اشاروں پر ناچتی ہے۔ کاش زرغونہ کا حسن سازینہ کے پاس ہوتا۔''

اور زرغونہ سے نفرت کچھ اور بھی بڑھ گئی۔

میز پر رکھی گھنٹی بجائی۔

ملازم سہما سہما کمرے میں داخل ہوا۔

''سرلا بائی کو میرے پاس بھیجو۔''

''بہتر بائی جی !'' کہتا ہوا ملازم کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد سرلا کمرے میں آئی۔ اسے بستر میں لیٹے دیکھ کر قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''آٹھ بج رہے ہیں ممتاز بائی! محفل شروع ہو چکی ہے۔ اور تم ابھی تک بستر میں ہو۔ طبیعت کیسی ہے؟''

''طبیعت کا کیا پوچھتی ہو؟ اب تو زندگی سے سکون کے دن رخصت ہو گئے ہیں۔''

اس نے مغموم نظروں سے سرلا کی طرف دیکھا اور ایک لمحہ توقف کے بعد بولی۔

''اس نابکار لڑکی کا کیا حال ہے؟''

''تڑپ رہی ہے۔میں نے دوا لگانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے لگانے نہیں دی۔''۔۔۔۔۔

سرلا نے بتایا۔

''کوئی ضرورت نہیں دوا لگانے کی ۔اسے مرنے دو۔ایسی اولاد سے ہم کیا بے اولاد اچھے نہیں ۔''

وہ خاموش رہی ۔کچھ سوچتی رہی اور پھر اسے تیار ہونے کا کہہ کر باہر آ گئی ۔

غسل کرنے کے بعد وہ محفل میں جانے کے لئے تیار ہونے لگی ۔پلکوں کو مسکارا سے حسین تر بنانے کی کوشش میں مگن تھی کہ سیٹھ نواز کی آمد کا نوکر نے مژدہ سنایا۔

''سیٹھ نواز علی !''

چونک کر اس نے خادم کو دیکھا۔اس کی آنکھوں میں حیرت واستعجاب نمایاں تھا۔

''تم نے کیا کہا ہے غفور؟''

اسے اپنی سماعت پر شبہ محسوس ہوا۔عدم اعتمادی سے نوکر کی طرف دیکھا۔

''سیٹھ نواز علی ۔بائی جی !میں انہیں جانتا ہوں۔''

''تم نے کہیں پہچاننے میں غلطی تو نہیں کی؟''

اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

ہرگز نہیں ۔ہم خادم لوگ انہیں کیسے بھول سکتے ہیں؟''

نوکر کے لہجے میں یقین کے ساتھ ساتھ عقیدت بھی تھی۔

''انہیں کمرہ خاص میں بٹھاؤ۔میں ابھی آ رہی ہوں۔''

ہونٹوں پر لپ اسٹک کا آخری ٹچ دیتے ہوئے اس کا ہاتھ خوشی سے کانپ رہا تھا۔آنکھیں مسرت کے بے پایاں احساس سے چمک رہی تھیں۔

سیٹھ نواز علی اس کے پرستاروں میں سے ایک تھا۔جس نے اس پر لاکھوں روپیہ بے دردی سے لٹایا تھا۔گزشتہ دس برس سے وہ اپنی تھیٹریکل کمپنی کے ساتھ وطن سے باہر تھا۔

آج وہ آیا تھا۔

وزنی قیمتی ساڑھی کا آنچل بازو پر سنبھالے آنکھوں میں ناچتی مسکراہٹ لئے وہ کمرہ خاص کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''زہے نصیب۔''

اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی مسکراہٹ کی بجلیاں گرائیں۔سیٹھ نواز علی کی آنکھوں میں شوق کی ایک دنیا امنڈ آئی۔اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے وہ بوجھل آواز میں بولا۔

''تمہارا حسن لازوال ہے ممتاز میری زندگی ! دیارِ غیر میں بھی دل تمہیں پکارتا رہا۔''

''بناناتو کوئی تم سے سیکھے نواز !اتنی توفیق نہ ہوئی کہ کبھی خط ہی لکھ دیتے۔''

''جانِ من !یہ بات نہیں۔دراصل مصروفیات نے وقت ہی نہ دیا۔''

''تو پھر اس جھوٹی محبت کے دعوے بھی نہ کرو۔''

اس نے تیکھی آنکھوں سے گھورتے ہوئے نازوادا کے تیر برسائے۔

نواز علی اور گھائل نہ ہوتا ؟تڑپ کر بولا۔

''حسن کے سامنے جھوٹ بولنا عشق کا شیوہ نہیں۔بخدا آنکھیں دید کو ترس گئی تھیں۔''

اس کی ٹھوڑی کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے وہ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔جہاں خمار انگڑائیاں لے رہا تھا۔

''ممتاز بائی !ان دس سالوں میں تم میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تمہارا حسن آج بھی دل کو اُسی طرح لبھا رہا ہے۔''

''تبھی تم نے کبھی پلٹ کر نہ پوچھا۔''

''ایسا نہ کہو ممتاز بائی !مجھے دلی تکلیف ہوتی ہے۔''

''تلخ حقیقت تکلیف ہی دیا کرتی ہے۔''

''ممتاز بائی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔''

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔یہ بتاؤ کہ کیسے رہے۔کاروبار کا کیا حال ہے اور وطن کب واپس آئے؟''

''اتنی ڈھیر ساری باتیں پوچھ ڈالی ہیں پیاری۔''وہ مسکرایا۔

''بتانے سے کیا گریز ہے؟''ممتاز بائی نے ادا سے گھورا۔

''گریز کیسا میں نے تو از راہ مذاق کہا تھا۔لوسنو۔اس نے اس بالوں سے کھیلتے ہوئے ساری باتیں سنا ڈالیں کہ اب اس کا تھیٹریکل ادارہ ایک فلم ساز ادارہ بن چکا ہے۔جس کی بیشتر فلمیں باکس آفس پر ہٹ ہوئی ہیں۔اس نے ہالی وڈ کے اشتراک سے کئی رنگین فلمیں بھی بنائی ہیں۔آج کل وہ ایک نئی فلم بنا رہا ہے۔جس کے لئے اسے چند نئے چہروں کی ضرورت ہے۔''

''ہاں ممتاز مجھے یاد آیا۔۔۔''اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''تمہاری ایک بیٹی بھی تو تھی۔سرخ و سفید خوبصورت اور معصوم سی۔وہ کہاں ہے؟

بیٹی کا ذکر آتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔خوشی سے چمکتا چہرہ پلک جھپکتے میں اداس ہوگیا۔

''کس منحوس کا ذکر لے بیٹھے ہو نواز !''

وہ تلخی نہ چھپا سکی۔

''کیوں خیریت؟''نواز علی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

خادمہ چائے کی کشتی لئے کمرے میں داخل ہوئی ۔نواز علی کے حضور آداب بجا لانے کے بعد اس نے چائے بنائی اور دونوں کو پیش کی ۔کمرے میں خادمہ کی موجودگی کی وجہ سے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

ابرو کے اشارے سے ممتاز بائی نے خادمہ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

''ممتاز !تم نے مجھے کچھ بتایا نہیں۔''نواز نے تپائی پر چائے کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا بتاؤں؟''ممتاز نے سرد آہ بھرتے ہوئے اداس نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیں ۔اور پھر اس کے بار بار اصرار پر ممتاز بائی نے ساری تفصیل اس کے گوش گزار کر دی۔

خدا کی شان !اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

''لیکن تمہیں اس کے ساتھ اتنا بہیمانہ سلوک روا نہیں رکھنا چاہئے پیار و محبت سے تم اسے ممکن ہے بدل ڈالو لیکن سختی رائیگاں جائے گی ۔جوان اذہان تشدد پر بھڑ اٹھتے ہیں۔''

ویسے وہ قدرت کے اس نرالے کھیل پر حیران ضرور تھا۔

''جس دل پر چوٹ لگتی ہے ۔تڑپ کا احساس صرف اسے ہی ہوتا ہے ۔خود سوچو نواز! دل نہیں جلتا۔طبیعت نہیں کڑھتی ۔اس نے ہر آس اور تمنا کا گلہ گھونٹ ڈالا ہے۔''

''تمہارے درد کو بخوبی سمجھتا ہوں۔کیا تم مجھے اسے دکھا سکتی ہو۔''

''کیوں نہیں ۔ویسے وہ آج ٹھیک نہیں۔''

اور جب وہ اسے لئے زرغونہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اوندھے منہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ قدموں کی چاپ پر اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ اور ماں کے ساتھ کسی اجنبی کو دیکھ کر سر دوبارہ تکیے پر پٹخ دیا۔ تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

نواز علی کو یوں محسوس ہوا جیسے دبیز بادلوں کو تہہ ہٹا کر چاند ایک لمحے کے لئے جھلک دکھا گیا ہو۔

وہ اپنی جگہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔

''اتنا مکمل حسن۔۔۔ ایسا شگفتہ اور معصوم چہرہ۔۔۔

یہ فلم انڈسٹری میں تہلکہ مچا سکتا ہے۔''

اس کے کاروباری ذہن نے فوراً سوچا۔

زرغونہ نے تکئے پر سر چند بار بیزاری سے پٹخا۔ ماں کے ساتھ اجنبی کو دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ کوئی نیا گاہک مال پسند کرنے آیا ہے۔

ممتاز بائی نے نواز علی کی طرف استفہامیہ انداز میں دیکھا۔ نگاہوں کا سوال واضح تھا۔ نواز علی نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

''تمہیں ممتاز بائی! عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں''۔۔۔ میں نے ایک لمحے میں ہیرے کو پرکھ لیا ہے۔ آؤ چلیں۔ اسے تکلیف ہے، آرام کرنے دو۔''

''ممتاز! یہ تو تمہیں بھی مات کر گئی ہے؟'' اس نے صوفے پر خود کو گراتے ہوئے کہا۔

''کیا فائدہ؟'' اُس کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

''اتنی مایوس کیوں میری جان؟''

''سب کچھ جاننے کے باوجود یہ سوال کرتے ہو۔ تاریک مستقبل سر پر کھڑا ہے

اور پوچھتے ہو مایوس کیوں ہوں؟''

''نہیں یہ غلط ہے تمہارا مقدر روشن ہے۔زرغونہ تمہارے لئے حسین مستقبل کی پیامبر ہوگی۔گھبراؤ نہیں اس کا فوری علاج کراؤ۔اور اسے یہاں سے لے کر باہر آجاؤ۔مجھے امید ہے کہ وہ فلمی دنیا میں قیامت برپا کردے گی۔''

اس نے چیک بک سے بیس ہزار کا چیک لکھ کر پھاڑتے ہوئے اس کی طرف بڑھایا۔اور اٹھتے ہوئے بولا۔

''فکر کی ضرورت نہیں۔''

باب نمبر:۱۳

''یہ مہذب معاشرہ''بڑبڑاتے ہوئے اس نے چمکیلی میز پر سر رکھ دیا۔
سٹوڈیو کی دنیا برقی روشنیوں میں لپٹی لپٹائی اس کے تصور میں تیز رفتار ٹرین کی مانند آئی۔
مضافاتی علاقے کی وسیع خوبصورت شاہراہوں پر تعمیر سر بفلک عمارتوں کے مکین اپنی تمام تر عریانیوں کے ساتھ ہوا کے کسی گرم جھونکے کی مانند خیال میں ابھرے۔
مغربی موسیقی کی دل نواز تانوں پر بال روم میں رقص کرتے جوڑے مخمور نگاہیں لئے آنکھوں کے سامنے آ گئے۔
''یہ مہذب معاشرہ۔''گھٹی گھٹی آواز اس کے منہ سے نکلی اور عالم اضطراب میں جانے کتنی بار اس نے سر میز سے اٹھا اٹھا کر جھٹکا۔
''چراغ تلے یہ اندھیرا۔'' نفرت میں بجھے زہریلے تیر آنکھوں کی راہ سے دل میں اترنے لگے۔وہ تیر جو اس جرم کی پاداش میں برسائے گئے تھے۔کہ طوائف زادی ہے۔

ممتاز بائی کے ساتھ جب وہ سٹوڈیو کی دنیا میں داخل ہوئی تو اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ کی اجلی کرنیں رقصاں تھیں۔ کوٹھے سے اتر کر کھلی دنیا میں آ جانے کا احساس طمانیت سے بھرپور تھا۔ حیرت و دلچسپی کا ملا جلا تاثر اس کے معصوم چہرے پر کھیل رہا تھا۔ لبوں پر ملکوتی تبسم بکھیرے وہ ہر چیز کو غایت دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ یہ سب چیزیں مہذب معاشرے کی تھیں۔ ان کا سب کا تعلق پاکیزہ بستی سے تھا۔ اور اسے ان سب سے محبت تھی۔ گہرا پیار تھا۔ وہ اسی دنیا سے تو اپنا ناطہ جوڑنا چاہتی تھی۔ جہاں آفتاب کی روپہلی کرنوں میں کام ہوتا ہے اور ستاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آرام۔

رائل بلیو ساڑھی میں لپٹے اس کے دل آویز وجود پر ہر شخص کی نگاہیں پڑیں۔ اور ٹھٹک کر رہ گئیں۔

مردوں کی ٹھٹکی ہوئی نگاہیں جو اس کے حسن کو دیکھ کر مبہوت ہو گئی تھیں۔ صنف نازک کی ٹھٹکی ہوئی نگاہیں جن میں حسد، جلن اور رقابت و رشک کے شعلے لپک اٹھے تھے۔

''یہ کون ہے؟ سوالیہ انداز میں سبھی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اتنا مکمل اور معصوم حسن آج تک اُن کی نظروں سے نہ گزرا تھا۔ وہاں چند لوگ ممتاز بائی کو بھی جانتے تھے، پہچانتے تھے۔

اور اس خبر نے پل بھر میں ہی سٹوڈیو کے سارے فاصلے طے کر لیے تھے۔ رشک و حسد کی دہکتی آگ پر یہ خبر تیل کا کام دے گئی تھی۔

''طوائف زادی ہے۔ رنڈی کے کوٹھے سے آئی ہے۔'' کہنے والوں نے خود کو فراموش کر دیا تھا۔ زہر یلے لہجے میں سرگوشیوں میں باتیں کی جا رہی تھیں۔

زرغونہ نے پلٹ کر دیکھا۔ ان آنکھوں میں تحقیر کے جذبات نمایاں تھے۔ اس کا دلکش مسکراتا چہرہ بجھ گیا۔ رخساروں پر پھیلے شفق رنگ زردیوں میں بدل گئے۔ دل یہاں سے

بھاگ جانے کو چاہا۔

''ماں میں تھک گئی ہوں اب گھر چلو۔'' اس نے اکھڑے اکھڑے سے لہجے میں بمشکل یہ الفاظ ادا کیے۔

''ہوش میں ہو زرغونہ۔۔۔۔'' ماں نے ڈانٹ پلائی۔

''میں اسی وقت گھر جانا چاہتی ہوں۔'' وہ یک دم بپھر اٹھی تھی۔

''کیا بات ہے؟ زرغونہ پریشان سی نظر آ رہی ہے۔'' نواز علی نے قریب آتے ہوئے استفسار کیا۔

''بات کیا ہونی ہے وہی اپنی اوقات پر اتر رہی ہے۔'' ممتاز بائی نے تلخی سے کہا۔

''ناراضگی کی کیا ضرورت ہے؟ یہ ماحول بھی تو اس کے لیے نیا ہے؟ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔''اس نے مشفقانہ انداز میں زرغونہ کے کندھے تھپتھپائے۔سیٹھ نواز علی کا رویہ اس کے ساتھ حد درجہ مشفقانہ تھا۔

اس نے ممتاز بائی کو اُسے چند دن باقاعدگی سے سٹوڈیو لانے کے لئے کہا تاکہ ماحول سے قدرے مانوس ہو جائے تو اُسے کام دیا جا سکے۔

ڈیڑھ دو گھنٹے وہاں گزارنے کے بعد وہ نئے گھر میں واپس آ گئی اور دریچے سے باہر سڑکوں پر انسانوں کو چلتے پھرتے دیکھنے لگی۔

عریاں بازو، تراشیدہ بال، چہرے پر غازے اور لالی کی تہیں، حرکات میں مصنوعی پن۔۔ذہن بج اٹھا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

رات کو سیٹھ نواز علی اور ممتاز اسے شہر کے سب سے بڑے کلب میں لے گئے۔ کلب کی رونق شباب پر تھی۔پھولوں کے کنج میں بیٹھے ایک جوڑے پر بے اختیار اس کی

نگاہیں جم گئیں ۔تراشیدہ بالوں والی ایک عورت ایک عمر رسیدہ مرد کے شانوں پر سر رکھے بیٹھی تھی ۔عریاں بازو اور گہرے گول گلے میں سینہ چھلک چھلک کر بہار دکھا رہا تھا۔

ان سے قدرے فاصلے پر ایک اور جوڑا ارغوانی جام ہاتھوں پکڑے پینے پلانے میں مشغول تھا۔

وہاں ہر طرف ہلچل تھی ۔حسن اور عشق گلے مل رہے تھے ۔ماحول عمر خیام کے اشعار کی تفسیر نظر آ رہا تھا۔

سیاہ اور سفید چکنی ٹائیلوں کا فلور اس پر رقص کرتے ہنستے مسکراتے جوڑے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے سینے سے سینہ ملائے جذبات کی حدت سے تمتماتی آنکھوں سے رنگین ماحول میں ڈوبے ہوئے تھے ۔

ابکائی محسوس ہوئی۔

''یہ ماحول ۔۔۔یہ۔۔۔یہ طوائف کے کوٹھے کو بھی مات کر رہا ہے ۔۔۔یہ مہذب معاشرہ ہے۔۔۔یہ پاکیزہ دنیا ہے۔''

چند ہی دنوں میں مہذب اور پاکیزہ دنیا کے رخ سے شرافت ،نیکی اور پارسائی کے دبیز پردے سرکے اور جو چہرہ اسے نظر آیا وہ اتنا بھیانک اور ڈراؤنا تھا کہ اسکی روح تک کانپ اٹھی ۔اور تب اس نے بے اختیار طنزیہ انداز میں سوچا ۔

''طوائف اس معاشرے کی چمکتی جبین پر ایک بدنما دھبہ ہے جس کی اپنی پیشانی ہی داغدار ہے ۔سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بل بوتے پر شرافت کے دعوے ہیں ، کس زعم میں گردنیں اکڑی ہوئی ہیں ۔اور خود کو کیا سمجھا جا رہا ہے؟''

''طوائف زادی ہے ۔رنڈی کے کوٹھے سے آئی ہے۔''

حقارت سے کہے گئے ان الفاظ کی صدائے بازگشت کانوں نے سنی ۔کھا جانے

والی نگاہیں اپنے اردگرد طواف کرتی محسوس ہوئیں۔

''اپنے دامن میں تو جھانک کر دیکھا نہیں نا۔'' بے اختیار اس نے سوچا۔

اور عین اس لمحے اس کے دل میں فخر و امتیاز کا وہ احساس پیدا ہوا جس سے وہ اب تک محروم تھی۔

''میں عظیم ہوں اور میرا کردار عظیم تر۔ جو کوئلوں کی کان میں رہتے ہوئے بھی سیاہی سے ملوث نہ ہو سکا۔ تاریکیوں میں پروان چڑھ کر بھی ان میں نہ ڈوب سکا۔۔۔

اور یہ لوگ۔۔۔

اس کے چہرے پر تمسخر ہی تمسخر پھیل گیا۔

یہ جو اجالوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ روشنیوں میں پلتے بڑھتے ہیں لیکن جو تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ میں انہیں کیا سمجھتی ہوں؟ میرے سامنے ان کی کیا حقیقت ہے؟ میں نے طوائف کے گھر آنکھ کھول کر طوائف کے منہ پر طمانچہ مارا ہے اور یہ شرافت کے منہ پر تھپڑ رسید کر رہے ہیں۔ عظیم کون ہے؟ میں یا وہ؟ وہ خود سے بولی۔

''یقیناً میں''

اس نے لمبی سانس لیتے ہوئے ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔

احساس کمتری یک سر رفع ہو چکا تھا۔ چہرے پر فخر کا حسین پرتو پھیل گیا اور اب وہ یکسر بدل چکی تھی۔

اس کی آنکھوں سے عظمت، چال سے وقار اور اطوار سے بڑائی ٹپکتی تھی۔

باب نمبر:۱۴

سرما کی جوانی پھوٹی پڑ رہی تھی ۔سردی کی تندو تیز ہوائیں درختوں کے پتوں سے ٹکراتے ہوئے مہیب اور ڈراونی آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ کائنات کو تاریکی کے دبیز غلاف نے ڈھانپا ہوا تھا۔ پہاڑی علاقے پر واقع اس خوبصورت چھوٹے سے بنگلہ نما گھر کے باورچی خانے میں بوڑھا ملازم دودھ کو جوش دینے میں مصروف تھا۔دودھ کو ابلتے دیکھ کر ملازم نے چولہا بند کر دیا۔پتیلی کو چند سیکنڈ ہلایا۔اور دودھ کو آہستہ آہستہ گلاس میں انڈیلنے لگا۔

''بورن وٹا'' دودھ میں اچھی طرح حل کرنے کے بعد وہ الگنی پر لٹکے کمبل کی طرف متوجہ ہوا۔اسے اچھی طرح اوڑھتے ہوئے اس نے گلاس اٹھایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ برفیلی ہوائیں دبیز کمبل کو چیرتی ہوئی اس کے وجود سے ٹکرائیں ۔بڑھا پا لرز سا گیا۔گلاس ہاتھوں میں مضبوطی سے تھامتے ہوئے وہ تیز تیز قدموں سے دوسری طرف مڑ گیا۔جالی والا دروازہ پاؤں کی ٹھوکر سے کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔کمرے میں گیس، دودھیا روشنی بکھیر رہا تھا۔آتش دان میں کوئلے دہک رہے تھے۔آرام کرسی پر نیم دراز احسن کسی کتاب کے

مطالعے میں محو تھا۔

''احسن بیٹے! لو دودھ پی لو۔''

ملازم نے بھر پور پدرانہ شفقت سے یہ جملہ کہا۔

''آ کا اتنی ٹھنڈ میں آپ نے کیوں تکلیف کی؟ گلباز کہاں ہے؟''

''وہ سونے کے لیے چلا گیا ہے۔میں نے اسے جگانا کچھ مناسب نہ سمجھا۔''

''لیکن آپ نے مجھ سے کہا ہوتا، یہ کام میں بھی تو کر سکتا ہوں۔''

''میرے بیٹے مجھے تیرے کام کرنے میں خوشی ہوتی ہے۔میری روح کو سکون ملتا ہے۔''

''اور آپ کا یہی سکون مجھے بے سکون کر جاتا ہے۔'' احسن نے قدرے ناراضگی سے کہا۔

''نہیں میرے بیٹے نہیں، دیکھ نا تو سارا دن انسانوں کی خدمت میں کمر بستہ رہتا ہے۔تیرے لیے اگر میں تھوڑا سا کام کر دیتا ہوں تو تو مجھے شرمندہ نہ کیا کر۔''

''لیکن سوال یہ ہے کہ یہ وقت آپ کے خدمت کرنے کا نہیں، خدمت کروانے کا ہے۔''

اگر تجھے میری تکلیف کا اتنا احساس ہے تو پھر میری خواہش پوری کر دے نا بیٹے۔''

بوڑھے آ کا کے لہجے میں زمانے بھر کی لجاجت سمٹ آئی تھی۔

''آپ کی خواہش کی تکمیل میرے بس کا روگ نہیں آ کا! خود سوچیے نا کون لڑکی شہروں کی گہما گہمی رونق اور بھر پور زندگی چھوڑ کر میرے لیے ان ویرانوں میں آئے گی۔ پھولوں کی موجودگی میں کانٹوں کی طرف کون پاگل لپکتا ہے؟''

''تیری منطق میری سمجھ سے بالاتر ہے۔تو تو پوجا کرنے کے قابل ہے۔اس لڑکی کا تو جیون درخشاں ہو جائے گا جو تیری زندگی کی ساتھی بنے گی۔''

''یہ باتیں آپ سوچتے ہیں نا آج کل کی لڑکیوں کو ان سے کوئی سروکار نہیں یہ مادی دور ہے۔جہاں ایسے احساسات کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔''

آ کا نے لمبی سرد آہ بھری۔تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولے۔

''بیٹے وہ تمہارا رشتہ دار اور دوست بھلا سا نام تھا اس کا۔۔آج کل کہاں ہے؟ کافی عرصہ ہوا اسے دیکھے ہوئے۔خیر سے اب تو شادی ہو گئی ہو گی اس کی۔''

''اوہ میں آپ کو بتانا بھول گیا ہوں وہ اور اس کی بیوی چند دنوں کے لیے یہاں آ رہے ہیں۔آج ہی اطلاع آئی ہے۔''

''اچھا وہ آنا چاہتے ہیں یہاں؟'' آ کا نے مسرت سے بھرپور لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے ان کے لیے کونے والا کمرہ ٹھیک رہے گا۔آپ کیا کہتے ہیں؟'' احسن نے آ کا سے رائے طلب کی۔

''ٹھیک ہے۔میں گلباز اور نور سے کمرہ صاف کروا دوں گا۔''

''آ کا اسے کچھ سجا بھی دیں۔'' اس نے کہا۔

''اسی لیے تو میں کہتا ہوں بیٹے اس گھر کو ایک عورت کی ضرورت ہے۔یہ عورتوں کے کام ہیں اور انہیں ہی زیب دیتے ہیں۔تو کیوں نہیں میری بات کو سمجھتا؟ کتنی خواہش ہے؟ کتنی آرزو ہے میری کہ وہ وقت جلد آ جائے جس کی تمنا میں ایک عرصے سے کر رہا ہوں۔''

لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔

''چھوڑیئے آ کا! کیاباتیں لے کر بیٹھ گئے ہیں آپ ۔میری زندگی میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ۔میرے دل نے رنگینیوں کی کبھی تمنا نہیں کی ۔مجھے تو زخموں پر پھاہے رکھ کر ہی سکون ملتا ہے۔

''بیٹے میری قسمت میں تیری خوشیاں دیکھنی نہیں ہیں ۔'' انہوں نے حسرت ناک لہجے میں کہا۔اور خاموش ہو گئے تھے ۔ان کی نظریں خلاء کو گھور رہی تھیں ۔کافی دیر بعد کچھ یاد آیا تو بولے۔

''احسن! موجو آیا تھا۔کچھ پیسے مانگ رہا تھا۔''

''کس لیے؟'' اس نے پوچھا۔

''لڑکی کی شادی کرنی ہے۔''

''آ کا آپ مجھ سے کیا پوچھ رہے ہیں؟ جتنے مانگ رہا تھا دے دیئے ہوتے۔''

''نہیں بیٹے تجھے اطلاع دیئے بغیر میں کیسے دے سکتا ہوں؟میرا دل نہیں مانتا۔''

''آ کا آپ نے ساری زندگی ہمارے لیے وقف کر دی ۔اور ابھی بھی یہ سمجھتے ہیں ۔میری سمجھ میں نہیں آتا یہ خیال آپ کے دماغ سے کیسے نکالا جائے ۔'' احسن جز بز ہو رہا تھا۔

''بیٹے ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ دو تین چار سو کی بات ہوتی تو میں تمہیں نہ بتاتا ۔چار پانچ ہزار کی بات ہے ۔میں اتنا بڑا قدم اٹھانا نہیں چاہتا۔''

''چار پانچ ہزار کا کہہ رہے ہیں ۔آ کا اگر آپ ساری جائیداد بھی بانٹ دیں تو بھی میں کبھی آپ سے نہ پوچھوں ۔۔۔۔آپ اپنا مقام میرے دل سے پوچھیئے ۔''

''مجھے تجھ پر فخر ہے بیٹے۔''

وہ یہی کہہ سکے ۔۔۔۔ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں ۔احسن نے انگڑائی لی ۔کلائی

سیدھی کرتے ہوئے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور اٹھتے ہوئے بولا۔

''نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ میں نماز پڑھتا ہوں اور آپ آرام کیجیے۔''

وضو کیا اور رب حقیقی کے حضور سر بسجود ہو گیا۔

آکا ابھی تک ویسے ہی بیٹھے تھے۔ نگاہیں بدستور اس پر جمی ہوئی تھیں۔ سوچ رہے تھے کہ بستی کے لوگ درست ہی کہتے ہیں۔ وہ انسان کے روپ میں ایک فرشتہ ہے۔ واقعی اس کے فرشتہ ہونے میں شبہ بھی کیا ہے؟ زندگی کی ہر رعنائی سے منہ موڑ کر وہ یہاں آبسا ہے۔ وہ جوان ہے۔ شباب کی مہکتی وادی کا راہ رو ہے لیکن عمر کا یہ رنگین دور کراہتی ہوئی روحوں کی چیخیں سننے میں گزار رہا ہے۔

ان کا ذہن کہیں سے کہیں بھٹک رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اس کے بچپن، لڑکپن اور جوانی کی تصویریں متحرک تھیں۔

''اے کاش اس کے والدین زندہ ہوتے۔''

احسن نے فرض پڑھے تو انہیں ویسے ہی بیٹھا دیکھ کر محبت سے کہا۔

''آپ اب آرام کیجیے آکا!''

''ہاں بیٹے میں جا رہا ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

''ہاں مجھے یاد آیا آکا کوئلہ لوگوں کو پہنچا دیا گیا ہے یا نہیں؟ اس بار سردی بہت شدید ہے۔''

''کافی گھروں میں پہنچ چکا ہے۔ چند ایک گھر رہ گئے ہیں۔ ان کے ہاں کل تک انشاء اللہ پہنچ جائے گا۔''

''فضلی کی ماں کو چند کمبلوں کی ضرورت ہے۔ کالے کمبل انہیں بھیج دیے۔''

''اللہ اس کے لیے تو آسمان سے کوئی حور بھیج دے۔''

وہ باہر جاتے ہوئے منہ ہی میں بڑبڑائے ۔

باب نمبر:۱۵

کیمرے کی تیز برقی روشنیوں نے اس پر ذرا بھی گھبراہٹ طاری نہ کی۔ کتنی ہی آنکھیں خود پر جمی دیکھ کر بھی اس کے قدم نہ ڈگمگائے۔ نواز علی نے لائٹیں درست کروانے کے بعد اسے سیٹ پر آنے کا اشارہ کیا۔ مکالموں کے کاغذ پر اس نے آخری بار نگاہ ڈالی۔ اور پھر کاغذ پاس کھڑی ممتاز بائی کو تھما دیا۔ سرخ سرخ آنکھوں والا فربہ جسم اسسٹنٹ ڈائریکٹر اس کے پاس آیا۔

''گھبرایئے نہیں۔ اگر شاٹ ٹھیک ہوا تو سمجھئے آپ نے میدان مار لیا۔''

پروقار قدموں سے وہ آگے بڑھی، کیسا اطمینان تھا اس کے چہرے پر۔۔ آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی اور اطراف میں کھڑے مرد عورتیں۔

لیکن وہ ہر احساس سے قطعی بے نیاز تھی۔

''اسٹارٹ'' کی آواز آئی۔ برقی لیمپ روشن ہوئے اور اس نے وہ چند مکالمے اداکاری کرتے ہوئے دہرائے۔ ٹیسٹنگ شاٹ تھا۔

جونہی برقی لیمپ گل ہوئے۔نوازعلی اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور دوسرے لوگ خوشی سے کھل اٹھے۔وہ ایک پیدائشی اداکارہ معلوم ہوتی تھی۔

''ممتاز! دلی مبارکباد قبول کرو۔زرغونہ ایک دن شہرت کے آسمان کا سب سے روشن ستارہ ہوگی۔کہواب تو خوش ہو۔''

نوازعلی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

خوشی سے اس کی باچھیں کھلی جارہی تھیں۔ادا سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''مبارکباد کے مستحق تو آپ ہیں سرکار! جنھوں نے اسے پرکھا۔اور چانس دیا۔''

''میرا اس میں کوئی کمال نہیں ممتاز بائی! زرغونہ میں خداداد صلاحیتیں موجود ہیں جن کو صرف بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔'' نوازعلی نے حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''شکریہ!'' اس نے پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔

لیکن زرغونہ ہر احساس سے بے نیاز کمرے کے کونے میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ گھنی گھنی مونچھوں والا میوزک ڈائریکٹر پیارے خاں اس کے پاس آیا۔گہری نظروں سے اسے دیکھتا ہوا اس کے قریب والی خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''آپ خاموش کیوں ہیں؟'' آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔خوش قسمت ہیں جو بغیر کسی تکلیف اور دردسری کے ہیروئن بن رہی ہیں۔ان کو دیکھئے۔''

اس نے چند ایک ایکسٹرا گرل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ہیروئن بننے کی تمنا دلوں میں لے کر آتی ہیں اور دلوں میں لیے ہی مرجاتی ہیں۔''

''احمق ہیں ۔ہیروئن بننا کیا زندگی کی معراج ہے ۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

میوزک ڈائریکٹر حیران ہی تو رہ گیا۔ہکلاتے ہوئے بولا۔

''تو آپ ایسا نہیں سمجھتیں؟''

''جی ابھی میرا دماغ بالکل درست ہے۔جب خراب ہو جائے گا تو ممکن ہے سمجھنے لگوں۔'' اس نے ناگواری سے کہتے ہوئے گویا گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

''آپ کیسی لڑکی ہیں؟'' وہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''عجیب وغریب ۔۔یوں کہئے دنیا کا آٹھواں عجوبہ۔''

''آپ میرے ساتھ آج شام چائے پینا قبول کریں گی؟'' اس نے نہایت مسکینی سے کہا۔

''دماغ ٹھکانے ہے آپ کا؟'' وہ تنتناتے ہوئے اٹھ گئی۔

ممتاز بائی کافی دور نواز علی سے باتوں میں مگن تھی ۔انہیں کچھ معلوم نہ ہو سکا اور پیارے خاں نے فوراً کھسک جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

''سالی اکڑتی ہے۔رعب دکھاتی ہے دیکھوں گا تجھے بھی ۔''

اس نے دل میں کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا میوزک روم کی طرف چلا گیا۔

''کل سے اسے باقاعدہ رول دیا جائے گا۔دس بجے سٹوڈیو لے آنا۔۔۔''

نواز علی نے ممتاز بائی سے کہا اور چلنے لگا۔لیکن چلتے چلتے رکا اور پلٹ کر دیکھا۔

''کیوں زرغونہ کیسا محسوس ہو رہا ہے؟''

''مجبوری کا نام شکریہ کیا کہہ سکتی ہوں؟'' اس نے نہایت اطمینان سے کہا۔

نواز علی مسکرا کر رہ گیا اور ممتاز بائی جل کر کوئلہ ہو گئی لیکن چالاک تھی، ظاہر نہ ہونے دیا۔

''آؤ بیٹے اب گھر چلیں بھوک لگ رہی ہوگی۔'' اس نے محبت بھری آواز میں کہتے ہوئے اس کا بازو پکڑا۔۔۔

چونک کر زرغونہ نے ماں کی طرف دیکھا لیکن وہ نظریں چرا گئی تھی۔ اپنے ہاتھ کو اس کی گرفت سے آزاد کراتے ہوئے وہ اس کے آگے چل دی۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ فلم والا خیال میرے ذہن میں پہلے کیوں نہ آیا؟''

اس نے کار کے ونڈ سکرین سے باہر دیکھتے ہوئے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا۔

''شکر کیجیے ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں گزری۔'' زرغونہ نے طنز کا بھرپور تیر چلایا۔

لیکن ممتا زبائی مستقبل کے خوش آئند تصور میں گم تھی۔

''سرلا اپی زرغونہ نے تو کمال کر دیا ہے۔ اتنی عمدہ اداکاری کی ہے سب لوگ دنگ رہ گئے۔'' وہ گھر میں داخل ہوتے ہی خوشی سے چیخ پڑی۔

سرلا بائی بھی خوشی سے آنکھیں جھپکاتی فوراً اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''کہاں ہے وہ؟'' اس نے بےصبری سے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں چلی گئی ہے شاید۔''

''سرلا دکھ ہوتا ہے کیوں اسے اتنی اذیتیں دیں؟ پہلے ہی ذہن اس طرف کیوں نہ گیا؟''

''چھوڑو! صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔ زرغونہ کو بلاؤ کھانا تیار ہے میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔''

ایک دن کے تجربے نے نوازعلی پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ اسے سکھانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اس کی گفتگو آنکھوں اور دیگر اعضا کی حرکات میں ایک ایسی قدرتی بے ساختگی تھی۔ جس پر اس کے خیال کے مطابق مزید ہدایت کاری کا ملمع نہیں چڑھنا چاہیے

تھا۔

دس بجے جب وہ اپنی پہلی شوٹنگ کے لیے فلور پر پہنچی تو اسسٹنٹ ڈائریکٹر سیٹ کے لیے ہدایات دے رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی خوشی سے نہال ہو گیا۔

''وقت کی پابند معلوم ہوتی ہیں۔ یہ بہت اچھی عادت ہے۔''

''کام کرنا ہے تو وقت کی پابندی ضروری ہے۔'' اس کے بجائے ممتاز بائی نے جواب دیا۔

''اس طرز فکر کو ہر کوئی نہیں اپناتا بائی جی۔'' اس نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

زرغونہ نے بیگ کھولا۔ سکرپٹ نکالا اور اطمینان سے اس پر جھک گئی۔

ایک دو بار اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے زرغونہ کو بلانے کی کوشش بھی کی لیکن وہ ہر احساس سے بے نیاز کاغذ پہ نظریں جمائے ڈائیلاگ اپنے ذہن میں دہراتی رہی۔

''آپ ریہرسل کے لیے تیار ہیں؟''

اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اپنا بازو بے تکلفی سے اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ چونک کر اس نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ سرخ سرخ آنکھوں میں خباثت ٹپک رہی تھی۔ زرغونہ کو اس کا ہاتھ اپنے کندھے پر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس پر بیس سیر کا کوئی ناگ بٹھا دیا ہو۔

''اسے اپنے مقام پر رکھیے۔ ورنہ اسے توڑا بھی جا سکتا ہے۔''

اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے خدائی قہر کو دعوت دے دی ہو۔ تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ سیٹ پر زیادہ لوگ نہیں تھے۔ ممتاز بائی نے یہ سب دیکھا تو مدھم آواز میں بولی۔

''بیٹے ان سب لوگوں کے ساتھ تمہیں کام کرنا ہے۔ یوں نہیں کرتے ذرا کندھے

پر ہاتھ ہی رکھ دیا تھا۔"

"تمہیں میرے معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔" اس نے ناگواری سے کہا۔

جذباتی مناظر کی عکس بندی کے لیے اس نے نوازعلی سے کہہ دیا تھا۔ کہ وہ کوئی فحش حرکت کرنا پسند نہ کرے گی۔ اور نہ اسے اس کے لیے مجبور کیا جائے۔

نوازعلی اس کی طبیعت سے واقف تھا۔ اصرار کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ تجربہ کار آدمی تھا۔ ہیر پھیر کا چکر دے کر تماشائیوں کی جنسی حس پوری کرنا جانتا تھا۔

یونٹ میں سبھی اس کے برتاؤ سے بہت کچھ سمجھ گئے تھے۔ اس لیے اکثر بات کرتے وقت احتیاط سے کام لیتے۔

آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے باہر جانا تھا۔ ہیرو اور ہیروئن کی ملاقات کے چند سین فلمانے تھے۔ اس کے مقابل جولڑ کا ہیرو کا رول ادا کر رہا تھا۔ خوش شکل اور فلم انڈسٹری کا مشہور ستارہ تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ جب زرغونہ سرلا بائی کے ساتھ وہاں پہنچی۔ سب لوگ پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر شوٹنگ شروع ہوئی اور چار بجے تک جاری رہی۔ چائے پینے کے لیے بیٹھے تو سب فرحت محسوس کر رہے تھے۔ کافی کام ختم ہو گیا تھا۔ قہقہے اڑ رہے تھے۔ اتفاق سے وہ ہیرو کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ چہرے پر اتھاہ سنجیدگی لیے وہ چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ حلق سے اتار رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔ کپ سے اٹھتی بھاپ کے مرغولوں میں اسے ہیرو کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ آنکھیں جن میں گرد آلود جذبے تیر رہے تھے۔

یہ آنکھیں کتنی مختلف تھیں ان آنکھوں سے جنہوں نے اسے زندہ رہنے کا پیغام دیا

تھا۔

کتنی پاکیزگی تھی ان میں۔

یہ پاکیزگی اُس کی ساری زندگی پر کسی جادو کی طرح چھا گئی تھی۔

''کس خوش نصیب کی یاد ستا رہی ہے؟'' ہیرو نے اس کی طرف جھکتے ہوئے ایک ادا سے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

''کیا کیا؟'' اس نے چونک کر دیکھا اور یوں ہیرو کو خود پر جھکے دیکھ کر اس کی بھنوئیں تن گئیں۔

''سنبھل کر بیٹھئے۔'' اس نے نفرت سے کہا۔

''سکھا دیجیے نا۔۔بیٹھنا نہیں آتا۔'' وہ اپنا چہرہ اس کے قریب تر لے آیا تھا۔

ایکا ایکی اس کا ہاتھ فضا میں لہرایا۔تڑ کی آواز آئی اور اس کا ہاتھ ہیرو کے بھرے بھرے گال پر طمانچہ مار کر واپس اپنی جگہ آ گیا۔

''سکھا دیجیے نا۔''

اس کی شعلہ بار نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔وہ کھڑی ہو گئی۔مٹھائی سے بھری پلیٹ کو اس نے ٹھوکر ماری۔اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے چلائی۔

''حد کے اندر رہنا سیکھئے میں زرغونہ ہوں۔''

سارے یونٹ کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔نواز علی حیرت سے گنگ تھے۔بقیہ لوگ بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔کسی کو بھی صحیح صورت حال کا علم نہ تھا۔

''کیا بات ہے سودی؟'' نواز علی نے کافی دیر بعد ہیرو سے پوچھا۔

''میں یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا۔''

وہ کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ مشہور اداکار تھا۔ ایکسٹرا گرلز اور معاون اداکارائیں اس کے ناز اٹھاتی پھرتی تھیں۔ اس دبلی پتلی لڑکی کی اتنی جرات! جس نے ابھی شہرت کا ایک زینہ بھی طے نہیں کیا۔ جلتا کیسے نہ۔

''میں نے تمہیں کیا کہا تھا؟'' نواز علی کی آواز میں سکون تھا۔

''میں نے کون سی اسے گولی ماردی تھی۔'' وہ غصے سے چنگھاڑا۔

''یہ طیش کم از کم نواز علی کو تو نہ دکھاؤ''

''میں اس بے عزتی کا ذمہ دار آپ کو سمجھتا ہوں۔'' وہ آگ بگولا ہوتے ہوئے بولا۔

''کیوں؟''

''اس دو ٹکے کی چھوکری کو آپ نے غیر معمولی اہمیت دے کر اس کا دماغ آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ میں اس کے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار نہیں۔''

''یہ دھمکیاں اس لیے دے رہے ہو کہ میں تمہیں اس فلم میں کاسٹ کر چکا ہوں۔ جاؤ عیش کرو۔ تمہارے لیے فلم ساز بہت اور میرے لیے ہیرو بہت۔''

فلم کافی بن چکی تھی۔ یونٹ کے لوگوں نے صلح صفائی کی کوشش کی لیکن ہیرو بھی اکڑا رہا اور نواز علی بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔

زرغونہ کمرے میں آ کر اوندھے منہ بستر پر گر گئی۔

''یہ سب میری برداشت سے باہر کیوں ہے؟ میں انہیں اپنا کیوں نہیں لیتی؟ اکیلی مجھے کیا ہو جاتا ہے۔''

وہ روتی رہی۔۔۔ بے بسی اور مجبوری کے آنسو رخساروں کو بھگوتے رہے۔ تبھی کمرے میں بھاری بھاری قدموں کی آواز آئی۔

''زرغونہ!'' کوئی اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

اس نے آواز پر سر اٹھایا۔روتی آنکھوں سے اپنے سامنے کھڑے نواز علی کو دیکھا آنسو اور بھی تیزی سے بہنے لگے۔

''زرغونہ نواز علی تیری حفاظت کرے گا۔وہ ہر اس ہاتھ کو کاٹ دے گا جو کسی سفلی جذبے کے تحت تیری طرف بڑھے گا۔''

''آپ نے کیا کہا ہے؟ ایک بار پھر کہئے۔۔۔پھر کہئے۔۔'' کیسی مایوسی تھی اس کے لہجے میں۔۔کیسی بے اعتباری تھی اس کی نظروں میں۔نواز علی تڑپ اٹھا۔

اس نے سر دوبارہ بستر پر گرا دیا تھا۔ہچکیوں سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔

''زرغونہ! میری بچی! اٹھو۔منہ ہاتھ دھوؤ جب تک نواز علی زندہ ہے تمہیں کوئی غم کرنے کی ضرورت نہیں۔''

اور کافی دیر تک بہلانے پھسلانے کے بعد وہ اسے چائے پلا رہا تھا۔

''لیکن آپ کا اتنا نقصان ہوگا۔'' اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

''زرغونہ یہ معمولی بات ہے۔زندگی میں دکھ و سکھ،نفع و نقصان کا ہر پہلو انسان کے مدنظر ہونا چاہئے۔میں اصول پرست آدمی ہوں۔'' اس کے لہجے میں اطمینان تھا۔

اور یہ نیا حادثہ اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔

باب نمبر:١٦

''ہوں'' شوخی سے مسکراتے ہوئے نعیم نے اپنے تعاقب میں آتی ہوئی اکیس بائیس سالہ لڑکی کو لمبی لمبی سانسیں لیتے دیکھا۔آسمانی سوٹ میں اس کا رنگ کھلا ہوا تھا۔

''کیوں خیریت؟'' وہ اس کی حالت سے خاصا محظوظ ہو رہا تھا۔

''اللہ! احسن بھائی نے کہاں ڈیرے جما لیے ہیں۔سانس پھولنے لگا ہے۔'' وہ ہانپ رہی تھی۔

''جلد ہی اکتا گئی ہو۔چلو نا اب۔بہت اشتیاق تھا تمہیں یہاں آنے کا۔'' نعیم نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا۔

''مجھ سے اب بالکل نہیں چلا جا رہا۔'' وہ وہیں کی وہیں کھڑی تھی۔

''ہمت کرو یاسمین! بس تھوڑی دور اور ہے۔لاؤ مجھے اپنا ہاتھ دو۔'' نعیم نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

اپنا سفید ہاتھ اس نے نعیم کے ہاتھ میں دے دیا۔وہ قدرے نیچے کھڑی تھی۔نعیم

نے اتنے زور سے ہاتھ پکڑ کر کھینچا کہ وہ چلا اٹھی ۔

''اف یوں کسی کو سہارا دیتے ہیں ۔''

''سمجھا دو نا ۔''

''تو جیسے بچے ہیں کہ انہیں کوئی سمجھائے ۔''

شادی کی انگوٹھی سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی ۔نعیم بغور دیکھنے لگا ۔

''دیکھ دیکھ کر دل نہیں بھرا ۔'' اس نے محبت سے اس کی طرف دیکھا ۔

''کبھی نہ بھرے ، دل بھر جائے تو جانتی ہو کیا ہوتا ہے؟

''جی ہاں'' اس نے سر ہلاتے ہوئے طنز سے دیکھا ۔اور اس کا دایاں کان پکڑتے ہوئے بولی ۔

''طلاق دے دوں گی آپ کو ۔''

اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ ہونٹ توڑ توڑ کر باہر نکل رہی تھی ۔نعیم بھی خوب ہنسا ۔

''آج تک تو سنتے آئے تھے کہ مرد ہی کو یہ حق حاصل ہے ۔لیکن اب ۔''

''عورتوں نے اسے چھین لیا ہے ۔''اس نے شوہر کی بات کاٹتے ہوئے کہا ۔

ہر سو بکھری ہوئی سنہری دھوپ ۔۔ٹھنڈی ہوائیں ۔۔سرسبز پہاڑیاں اور ایک نو بیاہتا جوڑا ۔۔۔

وقت کا کسے ہوش تھا ۔باتوں میں محو ہوئے تو کچھ خبر نہ رہی ۔کافی دیر بعد یاسمین کو احساس ہوا ۔

''خدا کے لیے اب چلنا بھی ہے یا یہیں رات گزارنے کا ارادہ ہے ۔''

''اوہ سوری واقعی بہت دیر ہو گئی ہے ۔''

اور دونوں ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھے جھومتے گاتے پھر پہاڑیوں پر چڑھنے لگے۔ سہ پہر ہو رہی تھی۔ وہ کاٹیج پہنچے۔ پہاڑیوں، سربلند درختوں اور سرسبز بیلوں میں گھرا ہوا یہ بنگلہ دیکھتے ہی یاسمین اپنی تھکن بھول گئی۔ آ کا اور دوسرے خادم ان کے منتظر تھے۔ احسن کلینک میں تھے۔ آ کا نے یاسمین اور نعیم کو پیار کیا۔

''بیٹے ہم تو بہت دیر سے تمہارے انتظار میں تھے۔ کھانا ٹھنڈا ہو گیا ہے۔''

''کوئی بات نہیں آ کا اب گرم کروا دیں۔ اتنی دیر میں منہ ہاتھ دھوتے ہیں۔''

''احسن بھائی کب تک آئیں گے؟'' یاسمین نے گلباز سے دریافت کیا۔

''بس آنے ہی والے ہوں گے۔ اطلاع بھیجی جا چکی ہے۔''

کھانا لگا دیا گیا۔ نوکر نے اطلاع دی نعیم اٹھ کر جانے لگا تو یاسمین نے روکا۔

''اللہ اتنی جلدی کیا ہے۔ احسن بھائی کو تو آنے دیجیے۔''

''چلو احسن بھائی کی چہیتی۔ ہم تو راستوں کی خاک چھانتے ہوئے آ رہے ہیں۔'' اس نے بیوی کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

''اتنی خوبصورت جگہ ہے تبھی احسن بھائی جمے بیٹھے ہیں۔'' یاسمین نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔

''تنہائی، ویرانی، اداسی خاک خوبصورت ہے۔''

''کیسی کور ذوقی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے فطرت سے ذرا لگاؤ نہیں آپ کو۔''

یاسمین الجھ پڑی۔

''فطرت کے حسین شاہکار کی عدم موجودگی میں ہر شے ویران ہے اپنا تو یہ فلسفہ ہے۔''

''آپ اور آپ کا فلسفہ بس۔۔۔''

''کہو کچھ غلط ہے۔ کیا میری غیر موجودگی میں تمہیں یہ مناظر اتنے ہی حسین نظر آئیں گے جتنے اب ہیں۔'' نعیم نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''ٹھیک کہتے ہیں آپ۔''

کھانا کافی مزیدار تھا۔ سیر ہو کر کھایا گیا۔ چائے پینے ہی لگے تھے کہ احسن آ گئے۔ یاسمین اٹھ کر گلے ملی۔ وہ ان کی عزیز بھی تھی۔ انہوں نے اس کے شانے تھپتھپائے۔

''چائے پیو گے؟'' نعیم نے پوچھا۔

اس انداز پرسش پر سبھی ہنس دیئے۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔'' یاسمین نے کہا۔

''کیوں نہیں۔'' ممکن ہے طبیعت نہ چاہتی ہو۔ اور ہماری وجہ سے مجبور رہوں۔''

''مجبور کے بچے! چائے بنا۔''

''کیوں یاسمین کیسی جگہ ہے یہ؟'' احسن نے پوچھا۔

''بہت خوبصورت احسن بھائی۔''

''راستے بھر تمہیں کوسی آئی ہے اور اب تمہارے سامنے بیٹھی تمہیں بنا رہی ہے۔'' نعیم نے ستانے کے لیے شوشہ چھوڑا۔

''میری توبہ! میں نے تو راستے کے بارے میں کہا تھا۔ خدا کے لیے ان کی باتوں پر نہ جایئے۔'' یاسمین پریشان ہو اٹھی۔

''کیسی بچھی جا رہی ہے۔'' اس نے مزید بھڑکایا۔

''بچھوں نہ میرا بھائی جو ہوا۔''

''شاباش اب ہوئی ہے مقابلے کی چوٹ۔''

وہ دونوں میاں بیوی کی نوک جھونک سے محظوظ ہو رہے تھے۔

''اچھا سنو! ہم اگلے ہفتے یورپ جا رہے ہیں۔اور جب وہاں سے واپس آئیں تو اس گھر میں نئے فرد کا اضافہ ہو چکا ہو۔ ورنہ ہماری تمہاری دوستی ختم۔'' نعیم نے الٹی میٹم دے دیا۔

''سوچو تو سہی کیا کہہ رہے ہو۔تم دونوں کے بغیر شادی رچا کر بیٹھ جاؤں۔''

آ کا پلیٹ میں گرم گرم پکوڑے لیے اندر آئے۔احسن کی بات کا آخری حصہ ان کے کانوں میں پڑ گیا۔

''بیٹا! تمہی لوگ اسے سمجھاؤ۔میں کہتا ہوں تو جواب دیتا ہے کہ کون لڑکی شہروں کو چھوڑ کر ان ویرانوں میں میرے لیے آئے گی۔''

آ کا آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔'' انہوں نے فوراً کہا۔

''احسن بھائی! آپ یہ کیوں کہتے ہیں ایک بار اشارہ تو کریں ایک سے ایک لڑکیاں نہ لا کر کھڑی کر دوں تو کہنا۔''

''اس کے لیے تو ہزاروں کا دعویٰ ہے۔میری لیے ایک ہی لا دو تو مان جاؤں۔''

نعیم نے اطمینان سے چائے کا تیسرا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بیوی کی طرف دیکھا۔

احسن اور یاسمین کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

''یاسمین یورپ جا رہی ہو ذرا لگام ڈال کر رکھنا۔''

''آپ گھبرایئے نہیں بھائی۔ مجھے لگام کسنی آتی ہے۔''

''شاباش خوب عزت افزائی کر رہی ہو شوہر کی۔''نعیم نے بیوی کی طرف جھکتے ہوئے ہنسے۔

''احسن بھائی ٹھیک کہتے ہیں۔ بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے آپ کے سلسلے

میں۔‘‘

’’تو یہ بات ہے۔الٹی پٹیاں خوب پڑھ رکھی ہیں۔‘‘

’’بس بس بنئے نہیں۔شہلا کے قصے تو ہماری اماں تک بھی پہنچے ہوئے ہیں۔‘‘

اس کی آواز میں دکھ سا تھا۔

’’اب بولو۔‘‘

’’کیا بولوں؟ جو بولتا ہوں اس پر نہ ان کے گھر والے یقین کرتے ہیں اور نہ ہی انہیں اعتبار ہے۔‘‘

’’اعتبار کیسے آئے؟ کئی دفعہ تو میں نے ویسپا پر جناب عالی کے پیچھے بیٹھے شانوں پر ہاتھ رکھے اور مزے مزے سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔بارہا میری سہیلیوں نے دیکھا اور گھر والوں کی بھی کئی مرتبہ نظر پڑی ہے۔‘‘ یاسمین زہر اگل رہی تھی۔

’’غصے میں آ گئی ہو۔نہیں یاسمین حقیقت کچھ اور ہی تھی۔مطمئن رہو۔تمہارا شوہر دل پھینک نہیں بس ذرا ایسے قصے کہانیوں سے دماغ کو تازہ رکھتا ہے۔‘‘

احسن نے یاسمین کا غصہ رفع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

پانچ دن دونوں ان کے مہمان رہے۔ایک دفعہ کلینک بھی گئے۔وہاں مریضوں کو دیکھ کر انہیں احساس ہوا کہ واقعی ہم نے ان انسانوں کو نظر انداز کیا ہوا ہے۔احسن کے اعلیٰ انتظامات دیکھ کر تو یاسمین دنگ رہ گئی۔

’’واقعی اس کی عظمت میں کسے کلام ہو سکتا ہے؟‘‘ یاسمین نے بے اختیار سوچا۔

’’وہ خوش قسمت لڑکی جو اس جیسے انسان کو ملے گی۔کیوں نہ اپنے مقدر پر ناز کرے گی۔‘‘

باب نمبر: ۱۷

پبلک کونئی اداکارہ سینہ کی فلم ''سحر ہونے تک'' کا شدید انتظار تھا۔اخبارات میں آئے دن طرح طرح کے اشتہارات کی اشاعت بے قراری کا موجب بن رہی تھی۔اخبار ہاتھوں میں پکڑتے ہی فلموں کے شیدائی تیزی سے صفحات پلٹتے، نگاہیں صفحے پر ادھر ادھر بھٹکتیں اور پھر پرسکون ہوکر نئے چہرے پر جم جاتیں۔گھنٹوں تبصرہ کیا جاتا۔قیاس آرائیاں ہوتیں۔اور فلم کے کامیاب یا ناکام ہونے کے امکانات پر غور وخوض کیا جاتا۔

اور آخر فلم ریلیز ہوگئی۔

تماشائی چہرے کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔قیاس اور حقیقت میں سرمو کوئی فرق نہ تھا۔صناع قدرت کا ایک ایسا انوکھا شاہکار جسے دست قدرت نے فارغ اوقات میں دل کی سچی لگن کے ساتھ تراشا تھا۔وہاں زرغونہ کب تھی ''سحر ہونے تک'' کی دکھی اور غم زدہ سینہ تھی۔جو اپنے کردار میں ڈوب ڈوب کر ابھری تھی۔مکالموں کی برجستہ ادائیگی، حرکات کا فطری اظہار اور چال ڈھال، غرضیکہ ہر چیز حقیقی معلوم ہو رہی تھی۔اتنی عمدہ اور

جان دار اداکاری کی توقع ایک نوخیز اور نئی فنکارہ سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ پوری فلم پر اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ اس کے سامنے باقی فنکاروں کی اداکاری بے جان نظر آ رہی تھی۔ سینما ہالوں میں اس کے مکالموں پر بار بار تالیاں پیٹی گئیں۔ نگاہوں نے اس کے حسن کو خراج عقیدت پیش کیا۔ زبانوں نے اس کی اداکاری کے قصیدے گائے اور دلوں نے اس فن کارہ کی عظمت کا اعتراف کیا۔

فلم ختم ہوئی۔ سینما ہالوں سے باہر نکلتے ہوئے لوگوں نے پیش گوئی کی کہ وہ اداکاری کے میدان میں نا قابل فراموش کردار ادا کرے گی۔ اور صف اول کی اداکاراؤں کو بہت جلد مات کر جائے گی۔ فلمی دنیا کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اسے ایک ذہین اداکارہ ملی۔

فلم باکس آفس پر نہ صرف کامیاب رہی بلکہ گولڈن جوبلی منائی۔ اور پھر تو ایک طوفان تھا جو زرغونہ کے گھر امڈ پڑا اس کے ڈرائنگ روم میں فلم سازوں کا جمگھٹا ہو گیا۔ اور اس جمگھٹے میں گھری ممتاز بائی مسکرا رہی تھی۔ آنکھوں میں روشنی تھی۔ بیٹی مضبوط سہارا بن گئی تھی۔ لیکن اس سہارے میں ابھی تناؤ بدستور تھا۔

پر وقار قدموں سے چلتی ہوئی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ وسیع و عریض کمرے میں ایک نظر دوڑائی۔

فلم سازوں کے توند نکلے پیٹ اور بھاری بھرکم جسم صوفوں پر بے تکلفی سے براجمان تھے۔

چہروں سے کرختگی ٹپک رہی تھی اور آنکھوں میں حریصانہ چمک زرغونہ نے ماں کو ایک نظر دیکھا۔

چمکتی آنکھوں کے ساتھ کس شان سے وہ ان کے درمیان گھری بیٹھی تھی۔ اپنی ماں کی آنکھوں کی چمک کا سبب وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اسے نفرت تھی اس چمک سے بس نہ

چلتاؤ گرنہ اسے نوچ ڈالتی اور گھپ اندھیرے وہاں پھیلا دیتی۔

''آپ لوگ کیسے آئے ہیں؟''

وہ غرور کا ایک نا قابل تسخیر پیکر نظر آ رہی تھی۔

''ہم۔۔ہم۔۔۔'' ان میں سے چند ایک گھگھیائے۔

''ہم آپ کو اپنی فلم میں کاسٹ کرنا چاہتے ہیں۔''

''میں سال میں صرف دو فلموں میں کام کروں گی اور وہ بھی کہانی سن کر۔'' اس نے رعونت سے اعلان کیا۔

''ضرور۔ضرور'' ان میں سے ہر ایک نے خوشامدانہ انداز میں تائید کی۔

''یوں کوئی مایا کو اپنے گھر سے بھی لوٹا تا ہے۔'' کمرہ خالی ہو جانے کے بعد ممتاز بائی چلائی۔

''قناعت کرنا سیکھو۔''

زرغونہ کے لہجے میں گہرا کرب تھا۔

''اپنے حواسوں میں نہیں ہو۔یوں کبھی کسی نے دولت کو نہیں ٹھکرایا۔یہ خدا کی ناشکری ہے۔'' ممتاز بائی کا لہجہ سخت شکایت آمیز تھا۔

''مجھ سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔''

زرغونہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔پیروں کو بیزاری سے پٹختے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

آج کل وہ سیٹھ نواز علی کی فلموں میں کام کر رہی تھی نواز علی اسے اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔مزاج اور طبیعت کو پرکھ چکا تھا۔ہمیشہ پدرانہ شفقت کا مظاہرہ کرتا اور یہی وجہ تھی کہ زرغونہ نے ہر فلم ساز کی پیشکش کو مسترد کر دیا تھا۔

سٹوڈیو میں وہ عین شوٹنگ کے وقت پہنچتی اور کام ختم کرتے ہی فوراً سٹوڈیو کی حدود سے باہر نکل آتی۔ کبھی کبھی اس کا دم الجھنے لگتا۔ بے نام سے اضطراب میں وہ کھو جاتی۔ کوئی بات کرتا تو کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ لوگ اسے بد دماغ، مغرور اور جانے کیا کیا سمجھتے؟ لیکن وہ ہر قسم کی تنقید اور رائے زنی سے بے نیاز تھی۔

وحشت جب حد سے بڑھ جاتی تو وہ کار کو تیز چلا کر آبادی سے دور نکل جاتی۔ سرسبز لہلہاتے کھیتوں کو کار کی کھڑکی سے پہروں گھورا کرتی۔ سیٹ کی بیک پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیتی۔ تب چپکے سے ایک باوقار چہرہ متانت سے قدم اٹھاتا اس کے خوابوں کی دنیا میں چلا آتا۔ گھمبیر آواز کانوں میں شہد کا سا رس لیے آ ٹپکتی اور شہنائی کی آواز کی طرح قلبی دنیا میں دھیرے دھیرے اترتی جاتی۔

رگ رگ میں طمانیت کی لہریں ہلکے ہلکے انداز میں رقص کرتیں۔ لیکن ایسے لمحات صرف چند منٹ ہی اس پر طاری رہتے۔ وہ کسی گہرے اضطراب میں پھر کھو جاتی۔ خیالوں کے تصور میں اُلجھ جاتی۔ نشست سیدھی ہو جاتی۔ آنکھیں کھل جاتیں۔ اور ان میں مایوسی کے گہرے اندھیرے پھیل جاتے۔ تب سر ہتھیلی پر ٹکا کر وہ دل سوز سے لہجے میں خود سے کہتی۔ بھلا مجھ جیسا پاگل بھی کوئی ہوگا جو اپنی اوقات اور حیثیت کو جانتے ہوئے بھی چاند ستاروں کی تمنا کر بیٹھا ہے۔ آکاش کی ان نورانی چیزوں کا میری دنیا سے کیا واسطہ؟ وہ تو روشنی کے لیے تخلیق کی گئی ہیں۔ اور اپنے مقام پر ہی اچھی لگتی ہیں۔ مجھ جیسے سرپھروں کے دامنوں کی بھی وہ کبھی زینت بنی ہیں ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔

دل تڑپتا اور اس کی آنکھوں سے قلبی درد خونی قطروں کی شکل میں ٹپک ٹپک پڑتا۔

باب نمبر:۱۸

''ٹھیک تو ہونا تم زرغونہ؟''

ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھ کا لمس،اس نے اپنی پیشانی پر محسوس کیا۔غنودگی میں ڈوبی ہوئی آنکھیں کھلیں۔سمیعہ کا موٹے موٹے نقوش لیے پریشان سا چہرہ اس پر جھکا ہوا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں،سمیعہ یونہی ذرا طبیعت اٹھنے پر مائل نہیں ہے۔'' اس نے محبت سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''ابھی ابھی جواد کی ٹرنک کال آئی ہے۔امی شاید ٹھیک نہیں مجھے فوری طور پر پہنچنے کے لیے کہا گیا ہے۔''

''کیا ہوا انہیں؟'' وہ یک دم ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ بیٹھی۔

''تفصیل معلوم نہیں۔یہی کہا گیا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے پہنچ جاؤ۔''

''اللہ تعالیٰ ان پر اپنی سلامتی رکھے۔اور انہیں عمر خضر عطا کرے(آمین)'' زرغونہ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔سمیعہ کی موٹی موٹی آنکھوں کو دیوار پر جمے دیکھ کر زرغونہ نے آہستگی سے کہا۔

''کس سوچ میں گم ہو؟ سامان ابھی تک کھولا نہیں گیا۔واپس چلتے ہیں۔''

''میرا خیال اکیلے جانے کا ہے۔جونہی میں نے صورت حال کو قدرے بہتر محسوس کیا۔میں لوٹ آؤں گی۔''

''یہ کیسے ممکن ہے سمیعہ؟ تمہارے بغیر یہاں رہنا بے کار ہے۔''

''زرغونہ تم ذہنی طور پر پریشان ہو۔واپس چلی گئیں تو انہی جھمیلوں میں الجھ جاؤ گی۔آب وہوا کی تبدیلی اور پرسکون ماحول ممکن ہے تمہیں کچھ آرام دے سکے۔''

''لیکن۔۔۔'' وہ تذبذب کا شکار معلوم ہو رہی تھی۔

''تم شاید خوف زدہ ہو۔'' سمیعہ نے استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''یہ بات نہیں مجھے صرف تمہاری رفاقت کا خیال تھا۔''

''گھبرانا نہیں۔میں انشاءاللہ جلد لوٹنے کی کوشش کروں گی۔''

اس کے سنگ قدم بڑھاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ڈرائیور جیپ میں تیار بیٹھا تھا۔خدا حافظ کہتے ہوئے وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور دوسرے لمحے جیپ سٹارٹ ہوگئی۔کتنی دیر تک مخملیں گھاس کے قدرے اونچے تختے پر کھڑی زرغونہ ڈھلوانی راستے پر اترتی جیپ کو دیکھتی رہی۔اور پھر بوجھل بوجھل قدموں کے ساتھ واپس کمرے میں آگئی۔سپرنگ دار پلنگ پر خود کو گراتے ہوئے وہ حد درجہ اداسی محسوس کر رہی تھی۔رات بھی وہ ٹھیک طرح سو نہ سکی تھی۔وہ مستقل ایک خاموش آگ میں جل رہی تھی۔یہ جلن اور درد کی کسک اس کا مقدر بنتی جا رہی تھی۔کو حالات نے جہنم کے ان شعلوں کو بجھا کر رکھ دیا تھا۔جو اس کی عفت و عصمت کی طرف تیزی سے لپک رہے تھے۔وقت نے اس کے سر پر

عزت وشہرت کا تاج رکھ دیا تھا۔حالات کو مکمل اس کی گرفت میں دے دیا تھا۔ممتاز بائی اب اس کے رحم کرم پر تھی۔لیکن پھر بھی وہ جل رہی تھی۔ ہر چیز اجنبی اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔ پرستاروں کے ڈھیروں خطوط اس پر جنونی کیفیت طاری کر دیتے۔خطوط کو بغیر پڑھے پرزے پرزے کرتے ہوئے وہ خود سے الجھ پڑتی۔

''میں نے اس چاہت کی کبھی تمنا نہ کی تھی۔ اس شہرت کو کبھی نہ چاہا تھا۔پھر۔۔پھر۔۔۔یہ سب مجھے کیوں دے دیا گیا ہے؟'' اور عین اسی وقت دو آنکھیں اس کے چہرے پر جھک آتیں۔

خلوص کی تیز روشنی اس کے گرد ایک ہالہ سا بنا لیتی۔

''یہ روشنی میری زندگی ہے کاش! میں تمہیں زندگی کے کسی موڑ پر ایک بار پھر دیکھ سکوں۔۔پھر دیکھ سکوں۔۔۔''

کتنے لوگ اس کی طرف بڑھے۔۔۔کتنے لوگوں نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا تھا۔ لیکن اس نے ہر بڑھتے ہاتھ کو نفرت سے جھٹک دیا۔اسے تو کسی آنکھ میں وہ پاکیزگی نظر نہ آ سکی تھی۔جس کی وہ متلاشی تھی۔

نئے ماحول کا ننگا پن بہت جلد اس پر عیاں ہو گیا تھا۔وہ اس دنیا میں آ کر بھی اداس تھی۔جس کی اس نے ہمیشہ تمنا کی تھی۔روح میں پھیلے درد کا احساس اسے کھائے جا رہا تھا۔ابھی سمیعہ جیسی مخلص دوست کی رفاقت اس کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔وہ اس کے جنونی پرستاروں میں سے ایک تھی۔جس نے کسی نہ کسی طرح اس تک رسائی کی اور پھر اپنے بے پایاں خلوص سے اس کے بے حد قریب آ گئی۔

سمیعہ اونچے اور مہذب گھرانے کی سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔رات وہ اس کے ساتھ اس پہاڑی مقام پر چند دن گزارنے کے لیے آئی تھی۔

''ناشتہ تیار ہے۔۔۔میز پر لگا دیا جائے؟''

خادم نے دستک دیتے ہوئے پوچھا۔

اس نے سر اٹھا کر نیم وا آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔دفعتاً اسے سمیعہ کے خالی پیٹ چلے جانے کا احساس ہوا۔

''سنو سمیعہ بی بی نے ناشتہ کیا تھا یا نہیں؟''

''جی انہوں نے صرف چائے کا ایک کپ لیا تھا۔''

سر دوبارہ تکیے پر رکھتے ہوئے اس نے بے بسی سے سوچا کہ وہ کیسی غلطی کر بیٹھی ہے؟

''میں جواب کا منتظر ہوں۔'' خادم نے مودبانہ انداز میں پھر کہا۔

''دس پندرہ منٹ انتظار کرو۔میں غسل سے فارغ ہو کر آ رہی ہوں۔''

شاور کے سوراخوں میں سے نکلتے ہوئے نیم گرم پانی کی دھاریں اس پر پڑ رہی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی۔

آخر اس سے ایسی غلطی کیوں ہوئی؟ ناشتے کی میز پر بھی اس سے کچھ نہ کھایا گیا۔ سمیعہ کی بھوک کے احساس نے اس کے حلق میں کانٹے ہی کانٹے پھیلا دیئے تھے۔ہر لقمہ ان میں اس بری طرح پھنس رہا تھا۔کہ نہ اگلے بنے، نہ نگلے بنے والی کیفیت تھی۔ناشتہ ادھورا ہی چھوڑ کر وہ باہر نکل آئی۔بوگن ویلیا اور ہار سنگار کے پیڑوں سے گھرا یہ بنگلہ جس خوبصورتی سے بنایا گیا تھا وہ اپنی مثال آپ تھا۔حد نظر تک اونچی نیچی گل پوش پہاڑیوں کے لامتناہی سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔آبشاریں چاندی کے خزینے لٹا رہی تھیں۔قدرت ہر طرف عریاں تھی۔

گھنٹوں ان حسین مناظر سے آنکھیں سیر کرنے کے بعد وہ اٹھی۔دوپہر کا کھانا

زہر مار کیا اور آرام کے لیے کمرے میں چلی گئی۔ سمیعہ کی کمی اسے بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔

کچھ سوتے کچھ جاگتے اور کچھ سوچتے ہوئے اس نے تین گھنٹے گزار دیئے۔ دریچے کا پردہ سرکا کر باہر جھانکا تو شام کا سرمئی آنچل فضا پر دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ آسمان پر بادلوں کی یلغار تھی۔ کئی لمحے تک وہ موسم کے حسن کو دیکھتی رہی۔ اور پھر وہ سر جھٹک کر باہر نکل آئی۔ نوکر سے گھوڑا تیار کرنے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سیاہ جینز میں ملبوس سفید عربی النسل گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھی پتھریلی تنگ سی سڑک سے نیچے آ رہی تھی۔ جو بڑی مہارت سے پہاڑیوں کو کاٹ کاٹ کر اس بنگلے تک پہنچنے کے لیے بنائی گئی تھی وہ خوب سیر کرنا چاہتی تھی۔ خوب تھک جانا چاہتی تھی تاکہ شب میں جی بھر کر سو سکے۔ غم اور پریشانی کے اخراج کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہ تھا۔

اودی اودی گھٹائیں سبزے سے ڈھکی کناروں والی پہاڑیوں پر سایہ فگن تھیں۔ اس کا گھوڑا سبک خرامی سے چل رہا تھا۔

پھولوں کی خوشبو میں رچی بسی ہوائیں اس کے چہرے سے ٹکراتیں تو خنکی کا لطیف سا احساس دے جاتیں۔ پہاڑیوں کی ڈھلان میں قدرے کمی آئی تو اس نے گھوڑے کی رفتار کو تیز کر دیا۔

چلتے وقت نہ اس نے رین کوٹ لیا اور نہ ہی کوئی چھتری۔ اودی گھٹائیں گہری ہو کر برسنے لگیں۔

تیزی سے برستا پانی، اطراف میں گہری گہری کھائیاں ٹیڑھے میڑھے راستے، ڈھلانی پہاڑیاں اور تیز رفتاری سے چلتا گھوڑا۔ باگیں کھینچ کر اس نے کئی مرتبہ گھوڑے کو درختوں کے جھنڈ کے پاس ٹھہرانے کی کوشش کی لیکن بارش کا ہر قطرہ جو اس پر ٹپک رہا تھا

تازیانے کا کام دے رہا تھا۔سہی سہمی خوف زدہ سی گھوڑے کی باگیں کھینچنے کی ناکام کوشش میں مگن تھی۔کچھ نہ جانتی تھی کہ بنگلے سے کتنا دور نکل آئی ہے۔

گھوڑا سرپٹ بھاگ رہا تھا۔

اچانک گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور لڑکھڑا کر یک دم رک گیا۔

اس کے اتنے تیزی سے بھاگنے لڑکھڑانے اور رک جانے کی وجہ سے وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔

پاس ہی گہری کھائی میں جا پڑی نوکیلے پتھروں سے سر ٹکرایا تو خون کا فوارہ اچھل پڑا۔سنبھلنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔

خون مسلسل دھار کی صورت میں اس کے سر سے پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ نقاہت کے اثر سے بے ہوش ہو چکی تھی۔

مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد احسن نے کلینک سے باہر نکل کر موسم کا جائزہ لیا۔بارش تھم چکی تھی۔اور شب کا تاریک غبار ہر سو تیزی سے پھیل رہا تھا۔وہ کلینک میں دوبارہ داخل ہوئے۔نئے مریضوں کو دیکھا۔ڈاکٹر اور کمپاؤڈر کو ان کے بارے میں خصوصی ہدایات دیں۔اور کاٹیج کی طرف چل دیئے۔کاٹیج بستی سے ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔

صرف پانچ چھ منٹ کا راستہ تھا لیکن بارش میں یہ راستہ بہت خراب ہو جاتا تھا اور انہیں گھر جانے کے لیے بستی کے اوپر سے خاصا لمبا راستہ طے کرنا پڑتا تھا۔

ٹارچ کی روشنی میں وہ اپنے راستے پر محتاط قدموں سے بڑھتے جا رہے تھے کہ یک دم ٹھٹک کر رہ گئے۔ان کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیل گئیں۔

دائیں طرف کی گہری کھائی میں ایک لڑکی کو پڑے ہوئے دیکھ رہے تھے۔رات

کی تاریکی میں پہاڑی علاقے کی اس ویران اور تنہا جگہ میں ایک لڑکی کا یوں پڑے ہونا حد درجہ حیران کن تھا۔

روشنی کے زاویے درست کرتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ نیچے کھائی میں اترنے لگے۔قریب بیٹھتے ہوئے انہیں نے آہستگی سے ایک ہاتھ سے اس کا سر سیدھا کرنے کی کوشش کی۔چہرے پر پہلی نظر پڑتے ہی ان کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچ گئی۔پیشانی پر سوچ وبچار کی لکیریں نمودار ہوئیں۔

''یہ شکل کہیں دیکھی ہے؟مگر کہاں دیکھی ہے؟'' دماغ ادھر ادھر بھٹک رہا تھا۔

نبض دیکھنے کے لیے ہاتھ اس کے سر کے نیچے سے نکالا تو چونک اٹھے۔ہتھیلی خون سے بھری ہوئی تھی۔تیزی سے اس کا سر دیکھا۔خاصا بڑا سوراخ تھا۔خون کی کافی مقدار خارج ہو چکی تھی۔نبض بہت سست تھی۔اور لڑکی کی زندگی شدید خطرے میں۔۔۔

ایک لمحہ توقف کیے بغیر احسن نے اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھایا۔اور کندھے پر ڈال کر تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔ایک زندگی کا سوال تھا۔ان کی چال میں غیر معمولی تیزی تھی۔

اسے بستر پر احتیاط سے لٹا کر انہوں نے آ کا کو پانی گرم کرنے کے لیے کہا۔کاغذ پر کچھ لکھ کر گلباز کو کلینک دوڑایا اور خود انجکشن لگانے کے لیے سرنج تیار کرنے لگے۔دونوں بازوؤں میں انجکشن لگانے تک پانی گرم ہو چکا تھا۔اس کے سر کے زخموں کو آہستہ آہستہ صاف کیا گیا۔احسن نے زخموں کی سٹچنگ کی بگلوکوز لگایا۔سامان کلینک سے پہنچ چکا تھا۔

کچھ اطمینان کا احساس ہوا تو انہوں نے اسے بغور دیکھا۔

لاشعور پر پڑے پردے یکے بعد دیگرے سرکنے لگے۔

وہ نچلے ہونٹ کے دائیں کنارے کو بے خیالی میں دانتوں سے کاٹ رہے تھے۔

''عجیب اتفاق ہے۔'' وہ بڑبڑائے۔

اس کا بے پناہ حسن اس حالت میں بھی جگمگا رہا تھا وہ احسن کو اس وقت لیونارڈو کی مونا لیزا معلوم ہوئی۔

اور اب انہیں ایک اور خیال پریشان کر رہا تھا۔ اس کے وارث اس کے واپس نہ پہنچنے پر ان لمبے چوڑے پہاڑوں میں اسے ڈھونڈتے جانے کہاں کہاں بھٹک رہے ہوں گے۔ اس نئے خیال نے انہیں حد درجہ فکرمند کر دیا۔

یہ پہاڑی علاقہ اپنے دلفریب نظاروں کی وجہ سے میدانی علاقے کے باسیوں کے لیے خاص کشش رکھتا تھا۔ یہاں ہر موسم میں سیاحوں کی بھاری تعداد سیر و تفریح کے لیے آتی۔ کہکشاں ہوٹل اس علاقے کا شاندار ہوٹل تھا۔ صاحب ثروت لوگ وہیں ٹھہرتے اور احسن کا خیال تھا کہ یہ لوگ بھی یقیناً یہیں ٹھہرے ہوں گے۔

خادم کو مناسب ہدایات دے کر ہوٹل بھیجا گیا۔

تقریباً تین گھنٹے کی سرگردانی کے بعد ملازم نے واپس آ کر اطلاع دی کہ وہ کہکشاں ہوٹل میں مقیم نہیں ہیں اور ہوٹل والوں نے اس سلسلے میں قطعی لاعلمی ظاہر کی ہے۔ اور یہ کہ اس نے ارد گرد بھی پتہ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

گلوکوز کی دوسری بوتل لگا دی گئی۔

اس رات احسن ایک لمحے کے لیے بھی آنکھ نہ جھپک سکے۔ آٹھ بجے صبح اس نے پل بھر کے لیے آنکھیں کھولیں لیکن پھر بند کر لیں۔ گلوکوز کی تیسری بوتل لگا کر احسن نے گلباز کو سمجھایا اور اسے کمرے میں چھوڑ کر کلینک چلے گئے۔ وہاں بھی کئی مریضوں کو دیکھنا ضروری تھا۔

احسن دوپہر میں ایک گھنٹے کے لیے آئے نوکر سے صورت حال دریافت کی۔

ایک اور انجکشن دیا۔

وہ بدستور بے ہوش تھی۔گلوکوز کے حیات آفرین قطرے دھیرے دھیرے اس کے اندر رداخل ہورہے تھے۔

شام کو اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔لیکن ابھی تک وہ مکمل ہوش میں نہ تھی۔ چندلمحوں تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔نوکر سے کچھ پوچھنے کی کوشش بھی کی لیکن انجکشن لگا کر اسے دوبارہ سلا دیا گیا۔

رات کو گیارہ بجے کے قریب اسے پھر ہوش آیا اور اس نے پانی مانگا۔چمچ سے اس کے منہ میں پانی ڈالا گیا۔اس وقت بھی وہ پوری طرح ہوش میں نہ تھی۔

احسن کمرے میں موجود نہ تھے۔تھوڑی دیر قبل سونے کے لیے چلے گئے تھے۔صبح صادق کے وقت اس نے آنکھیں کھولیں مکمل ہوش کے ساتھ۔اجنبی اجنبی جگہ نگاہیں ایک پل میں کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گئیں۔

تحیر سے آنکھیں خوفناک حد تک پھٹنے لگیں۔فلموں میں وہ ڈرامائی کردار ادا کرتے کرتے اس وقت بذات خود ایک ڈرامائی کردار بن گئی تھی۔

ہاتھ بے اختیار سر پر گیا۔پٹی کو محسوس کرتے ہوئے وہ اور بھی پریشان ہو گئی۔ پلکیں تیزی سے جھپکتے ہوئے اس نے ذہن پر زور ڈالا اور پھر موسلا دھار بارش کی دھند میں ہر چیز واضح تھی۔

''لیکن مجھے یہاں کون لایا ہے؟'' بے اختیار اس نے سوچا۔

اس کی نگاہیں کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔گیس کی دودھیا روشنی میں دیواروں کا ہلکا نیلا رنگ آنکھوں کو ٹھنڈک اور سکون کا احساس دینے کے ساتھ ساتھ مکین کے ذوق کو بھی ظاہر کرر ہا تھا۔سامان مختصر لیکن نفیس تھا۔خواب گاہ معلوم ہوتی تھی۔

ملحقہ کمرے سے ایک نرم نرم ٹھہری ٹھہری باوقار گھمبیر آواز فضا کے سناٹے کو چیرتی ہوئی بلند ہوئی۔کوئی قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا۔آواز میں کس غضب کا سوز تھا۔ اس نے سازو آواز کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔موسیقی سے آگہی رکھتی تھی۔سر اور تال کے رموز سے واقف تھی لیکن یہ سادہ سی آواز کس حسن سے دل کی دنیا میں اترتی جا رہی تھی۔ گوشت پوست کا تھرکتا وجود کسی جھیل کی طرح ساکت وصامت ہو گیا تھا۔یہ خدا کا کلام اسے تو کبھی اسے سننے کی توفیق ہی نصیب نہ ہوئی تھی۔آہ کتنی شہد ہے اس میں۔کتنی مٹھاس ہے اس کے بولوں میں۔یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا بھاری وجود کسی روئی کے گالے کی مانند فضا میں اُڑا جا رہا ہو۔ہلکا اور سبک۔

قلبی محسوسات کی شدت پانی بن کر آنکھوں میں تیرنے لگی۔اس نے آنکھیں بند کیں تو ڈھیر سارے آنسو آنکھوں کے گوشوں کی راہ سے پھسلتے پھسلتے بالوں اور کانوں کو بھگونے لگے۔

''آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' میٹھی سی ایک آواز اسے اپنے قریب ہی سنائی دی۔

چونک کر آنکھیں کھولیں۔

اور آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اسے اس پر یقین نہ آیا۔اس کی پلکیں حرکت کرنا بھول گئیں۔سیاہ پتلیاں تحیر کے اثر سے مغلوب ہو کر ایک جگہ جم سی گئیں۔

ایک جوان لڑکی کا ہوش میں آنے کے بعد خود کو کسی اجنبی جگہ اور غیر لوگوں کے درمیان یوں بے بسی کی حالت میں پا کر حیران ہونا قطعی فطری عمل تھا۔یہ سوچتے ہوئے احسن نے اس کی دل دہی کی۔

''گھبرائیے نہیں آپ یہاں بالکل محفوظ ہیں۔''

لیکن وہ یہ بھول گئے تھے وہ اگر کسی کو پہچان سکتے ہیں تو کوئی انہیں بھی پہچان سکتا ہے۔

''آپ اب کیسا محسوس کر رہی ہیں؟'' احسن نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔وہی نرم نرم لہجہ۔آنکھوں میں رچا بسا خلوص کا گہرا جذبہ اپنائیت لیے ہوئے چند الفاظ کی صدائے بازگشت فضا میں گونجی۔

''آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

اس نے گہری نگاہوں سے ایک بار پھر انہیں دیکھا۔خلوص کی چمکتی روشنی ان آنکھوں سے پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہی تھی۔اور ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔

''یہ تم ہو تم۔۔۔تم جس کی دید کی ازلی تمنا نے مجھے ہمیشہ مضطرب و بے قرار رکھا۔''

اس کے دل نے اپنے آپ سے کہا۔

آسودہ سی مسکراہٹ اس کے گلابی ہونٹوں پر پھیل گئی تھی۔دل کی دنیا میں خوشیوں کے دھنک جیسے رنگ جو کھلے تو ان کے عکس چہرے پر نمودار ہو گئے۔

''آپ کو چکر وغیرہ تو نہیں آرہے ہیں؟''

''نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

آکا چائے کی کشتی لیے اندر آئے۔اس کی آنکھیں کھلی دیکھ کر ٹرے کو میز پر رکھا اور اس کے قریب آگئے۔

''تیرا احسان ہے معبود کہ بیٹے کو ہوش آیا۔''

انہوں نے دونوں ہاتھ خدا کے حضور باندھتے ہوئے محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''میں یہاں کیسے آئی؟''

اس نے احسن کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی سی آواز میں پوچھا جو گردن کو قدرے خم دیئے ٹرے میں ناشتے کی چیزیں دیکھ رہے تھے۔

''تم تو زخمی تھیں بیٹے! احسن میاں تمہیں کھائی سے اٹھا کر لائے۔ دو دن تم بے ہوش رہیں۔خدا کا شکر ہے کہ اب تمہیں ہوش آ گیا ہے۔''

''سب سے پہلے ہمیں یہ بتایئے آپ کہاں قیام پذیر ہیں؟'' تا کہ آپ کے والدین کو اطلاع دی جا سکے۔ ہم نے مقدور بھر کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔'' احسن نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

آہستہ آہستہ اس نے جگہ کا نام اور مقام بتایا۔احسن نے گلباز کو بلا کر سمجھا دیا۔

''سنو!'' اس نے نوکر کو مخاطب کیا۔

''نوکروں سے کہنا کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں سمیعہ بی بی اگر آئے تو اطلاع کر دیں۔اور اپنا پتہ اچھی طرح سمجھا دینا۔''

جی اچھا کہتا ہوا خادم باہر چلا گیا۔

''آپ کیا پیئیں گی دودھ یا چائے؟''

ایک پل کے لیے اس نے ان آنکھوں میں جھانکا۔کچھ محسوس کیا۔

''جو آپ مناسب سمجھیں۔''اس کی آواز گری ہوئی تھی۔

قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ میری فلمی دنیا سے وابستگی کو نہیں جانتے۔لیکن کیا وہ یہ بھول گئے ہیں کہ مجھ سے ایک بار پہلے بھی مل چکے ہیں۔انہوں نے مجھے کچھ سمجھایا تھا کچھ پیغام دیا تھا۔وہ پیغام جو میرے دل کی گہرائیوں میں اتر چکا تھا۔

''خدانخواستہ تم پاگل ہو۔کون کسی کو یاد رکھتا ہے؟'' اس نے فوراً سے پیشتر اپنے

خیالات کی خود ہی تردید کردی۔

اس کی آنکھوں میں اداسی کا ہلکا ہلکا کہر اترنے لگا تھا۔

''اپنے مقام کو پہچانو اور اس سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو۔'' عقل نے من چلے دل کو سمجھایا۔

بائیں ٹانگ کے ٹخنے پر خارش سی محسوس ہوئی۔ ذرا سا ہلایا تو ناقابل برداشت تکلیف محسوس ہوئی۔ تڑپ اٹھی۔

''کیا بات ہے؟ وہ بجلی کی سی تیزی سے اس پر جھک گئے۔

''پاؤں۔۔۔۔'' اس نے کومگو میں کہا۔

احسن اس کے پاؤں کی طرف متوجہ ہوئے آہستہ آہستہ چھوا۔ ٹخنے کی ہڈی اتری ہوئی تھی۔ وہ حیران تھے کہ ان کی باریک بین نگاہوں سے یہ چیز کیسے پوشیدہ رہ گئی؟

''جسم کے کسی اور حصے میں درد تو نہیں ہو رہا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ دیکھنے کا انداز کسی خاموش فریادی کا سا تھا۔

''مجھے بتایئے بلا تکلف کہیے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔''

اور اس کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔ بے اختیار اس نے سوچا۔

تم مجھے اپنے ڈاکٹر ہونے کا بتا رہے ہو۔ مجھے۔۔ پہچانا تم نے مجھے۔ پہچانا نہیں شاید۔۔۔ ہاں تم نے پہچانا نہیں۔''

''میں اپنے شانوں میں درد محسوس کر رہی ہوں۔ شاید خراشیں آ گئی ہیں۔''

اس نے گھٹے گھٹے بوجھل لہجے میں کہا۔

آہستگی سے انہوں نے اس کے دونوں شانوں کو اپنے مضبوط بازوؤں میں یوں سہارا دیا جیسے وہ کانچ کا ایک کھلونا ہو، جس کے ذرا سے دباؤ سے ٹوٹ جانے کا احتمال ہو۔

ایک ہاتھ سے اسے تھامے ہوئے وہ دوسرے ہاتھ سے اس کے شانوں کا جائزہ لے رہے تھے۔خراشیں واقعی خاصی گہری تھیں۔آ کا کی مدد سے دوائی لگائی اور یوں ہی تکیوں کے سہارے اسے قدرے بٹھایا گیا۔آ کا اسے ناشتہ کروا رہے تھے۔اور وہ پاؤں پر لگانے کے لیے پلاسٹر تیار کر رہے تھے۔

سر کی پٹی بدلنے اور پلاسٹر چڑھانے میں خاصا دن چڑھ آیا تھا۔کلینک جانے کا وقت ہو رہا تھا۔

''مجھے آپ کا نام بھی ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔'' احسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میرا نام زرغونہ ہے۔'' اس نے اپنے سامنے دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''خدا حافظ۔'' گھمبیر سے لہجے میں کہا گیا اور کمرہ خالی ہو گیا۔

یہ قدم قدم پر بیگانگی اور اجنبیت کا سا احساس۔اف!

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔پٹیاں بندھے سر کو بے چینی سے ہلایا۔شدید تکلیف ہوئی۔

''کوئی مجھے سمجھائے۔۔۔کوئی مجھے سمجھائے۔میں یہ سمجھتے ہوئے بھی اس احساس سے پیچھا کیوں نہیں چھڑا لیتی کہ وہ میرے چارٹ پر میرا نام پڑھنے کے باوجود بھول گئے ہوں گے۔آخر مجھے کیا حق حاصل ہے کہ میں کسی سے توقعات وابستہ کروں۔''

''وہ کہاں اور میں کہاں؟ آسمان کی رفعتوں کو زمین کی پستیوں سے کوئی نسبت نہیں۔''

اسے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی آہنی برمے سے اس کا سینہ چھید رہا ہو۔

اور آ کا جوان کے لیے اس ویرانے میں کسی حور کی آمد کی دعائیں مانگا کرتے تھے

اب یوں محسوس کر رہے تھے جیسے ان کی دعائیں بارگاہ ایزدی میں شرف قبولیت حاصل کر چکی ہوں۔ تبھی تو اس نے یوں چپ چپاتے ایک اتنی حسین اور پیاری لڑکی کو یہاں بھیج دیا۔

احسن کے کلینک جانے کے بعد وہ حور کے پاس آ گئے۔ مسلسل پانچ گھنٹے تک اس سے احسن کی باتیں کرتے رہے۔ ہوش تب آیا جب کلینک سے نوکر دوپہر کا کھانا لینے آ گیا۔

آ کا کے جانے کے بعد وہ کمرے میں تنہا رہ گئی۔ دیواروں پر بکھرا شفاف نیلا رنگ احسن رضا کے کردار کی طرح چمک رہا تھا۔

ذہن کو اپنی دنیا کی طرف لوٹایا۔ ہر طرف خاک ہی خاک تھی۔

خوبصورت آنکھیں دیوار پر آویزاں بانس سے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے گلدان پر جم گئیں۔ ابروؤں کی درمیانی جگہ سکڑنے اور پھیلنے لگی۔ چہرے کے تاثرات خیالات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ بدلنے لگے۔ خود میں ڈوبی رہی۔ کتنی ہی دیر اور جب باہر نکلی تو چہرہ پرسکون اور آنکھوں میں لازوال چمک تھی۔

''میں تم سے ٹوٹ کر پیار کروں گی۔ ازلی پیاسی روح کو تمہارے پیار سے سکون پہنچاؤں گی۔ اور جب حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھ جائے گا۔ تمہارا پیار نفرت میں بدل جائے گا۔ تب ان لمحات کو اپنی پلکوں پر سجائے تمہاری روشن دنیا سے نکل جاؤں گی۔ اور اپنی راہوں کے گھپ اندھیروں میں یہ چراغ جلا کر ان راستوں کی تاریکیاں کم کرنے کی کوشش کروں گی۔ کون جانتا ہے ایسا کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو ہی جاؤں گی۔ یہ احساس تو نہ ہو گا کہ تہی دامن ہوں۔ بلا سے سینہ داغدار ہی کیوں نہ ہو۔

اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہے تھے۔

باب نمبر:۱۹

موٹے اور بھدے ہاتھوں کی پشت بڑھاپے کی بے شمار لکیروں سے گڈمڈ ہو رہی تھی۔ان پر پتلی موٹی نیلی نیلی رگیں نمایاں تھیں۔وہ ہاتھ اس وقت مشینی انداز میں کام میں مصروف تھے۔احسن کے بھوکے ہونے کا خیال کسی تیز رو کی طرح دماغ میں مسلسل گردش کر رہا تھا۔اور دماغ میں احساس کی یہ گردش اس کے بوڑھے اعضا میں بے پناہ قوت پیدا کر رہی تھی۔

''ایسا تو آج تک کبھی نہ ہوا تھا۔''

گلباز ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔جانے کہاں گیا ہے؟انہوں نے سوچا اور پیاز کاٹنے میں محو ہو گئے۔

معمول سے ڈیڑھ گھنٹہ تاخیر سے کھانا کلینک بھیجا گیا۔حور کو دس بجے یخنی دینی تھی اور اب ڈیڑھ بج رہا تھا۔پیالی سلیقے سے پلیٹ میں سجا کر جب وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ سو رہی تھی۔

''میری غفلت کی وجہ سے یہ بھی بھوکی ہی سوگئی ہے۔''

وہ پریشانی کے عالم میں کمرے سے باہر نکل گئے۔

چار بجے کے قریب وہ بیدار ہوئی۔آنکھ کھلتے ہی شدید بھوک کا احساس ہوا۔صبح صرف ایک کپ دودھ پیا تھا۔

میز دائیں ہاتھ سے بجایا۔آکا شاید ایسی ہی کسی دستک کے منتظر تھے۔تیزی سے کمرے میں آئے۔شفقت سے اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولے۔

''بیٹے! تم سے باتوں میں ایسا مگن ہوا کہ کھانا تیار کرنا یکسر بھول گیا۔تمہارے لیے سوپ لے کر آیا تو تم سوچکی تھیں۔بہت بھوک لگ رہی ہوگی بیٹے کو۔سوپ لاؤں نا؟''

''آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں وہ لڑکا کہاں ہے؟ابھی تک آیا نہیں وہ؟''

''کب کا آچکا ہے بیٹے!''

''کیا کہتا ہے اسے ذرا میرے پاس بلایئے۔''

گلباز نے اندر آکر ساری تفصیل سے اسے آگاہ کیا کہ نوکر سخت پریشانی کے عالم میں گرفتار تھے۔تین مرتبہ سمیعہ کوٹرنک کال کرنے کی بھی کوشش کی گئی لیکن لائن خراب ہونے کی وجہ سے رابطہ قائم نہ ہوسکا۔بہرحال اب وہ مطمئن ہیں۔میں نے انہیں اچھی طرح پتہ سمجھادیا ہے۔ویسے ہم لوگ یہاں کسی کے لیے بھی اجنبی نہیں۔

''گلباز اب سوپ گرم کرکے لے آؤ۔''

آکا نے اس کے اردگرد تکیے رکھے۔آہستگی سے اسے قدرے اوپر کرتے ہوئے نیم درازسی حالت میں کردیا۔سوپ کا کپ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئے اور ادھر ادھر کی دلچسپ باتوں سے اس کا دل بہلانے لگے۔

زرغونہ نے سوپ کے چند گھونٹ ہی پیئے ہوں گے جب احسن کمرے میں داخل

ہوئے گھر پر ایک مریض ہونے کی وجہ سے وہ کلینک سے جلد آ گئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی زرغونہ کی آنکھیں چمک سی گئیں۔

''چائے پلا رہے ہیں آ کا!''

ان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

''چائے نہیں سوپ بیٹے! آج تو بھوک نے خوب ستایا ہوگا؟''

''کیا ہوا تھا؟'' احسن نے بشاشت سے پوچھا۔

''گلباز تو پیغام لے کر گیا ہوا تھا۔ میں بیٹے سے باتوں میں ایسا لگا کہ وقت کا احساس ہی نہ رہا۔''

''اس نے واپس آ کر کیا بتایا؟'' احسن اب براہ راست زرغونہ سے مخاطب تھے۔

''تو کر پریشان تھے بس انہیں سمجھا دیا ہے۔''

''آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''آپ ڈاکٹر ہیں میرا خیال ہے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔''

کپ واپس آ کا کو دیتے ہوئے اس نے کسی قدر شوخی سے احسن کو دیکھا۔ سو کر اٹھی تھی۔ آنکھیں خمار آلود سی تھیں۔ ہلکی ہلکی سرخی جھلک رہی تھی۔

''آپ نے انہیں دوپہر میں بھی سوپ دیا تھا؟''

''کہاں بیٹے؟ اسی بات کا تو رونا رو رہا ہوں۔ یہ سو گئی تھیں۔''

''اچھا چھوڑیئے اب چائے کب ملے گی؟''

''ابھی'' انہوں نے پلیٹ اور کپ اٹھا کر کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

احسن نے شانوں کے زخم پر دوا لگائی۔ سر کی پٹی کو بدلا اور پاؤں کا معائنہ کیا۔ اس

تمام وقت میں زرغونہ ایک لطیف سے سرور میں ڈوبی رہی ۔لیکن یہ سرور آناً فاناً اس وقت ٹوٹ گیا جب اس نے احسن کے ہاتھ میں انجکشن لگانے کے لیے سرنج پکڑے دیکھی ۔

''نہیں میں انجکشن نہیں لگواؤں گی ۔''

آنکھوں کی پلکیں تیزی سے حرکت کر اٹھیں ۔نچلا گداز ہونٹ قدرے پھول گیا اور دا ہنا ہاتھ زور زور سے ہلتا ہوا فضا میں نفی کا اشارہ واضح کرنے لگا۔

''گھبرایئے نہیں تکلیف نہیں ہوگی ۔''احسن بے اختیار مسکرائے جا رہے تھے ۔وہ بچوں سے بھی گئی گزری نظر آ رہی تھی ۔

''نہیں ۔نہیں ۔خدا کے لیے نہیں ۔'' اس نے سر زور سے ہلایا ۔

''کیا کر رہی ہیں آپ؟ سر کے زخم ابھی کچے ہیں ۔'' احسن ایک دم سنجیدہ ہو گئے تھے ۔بے بسی سے اس نے قریب کھڑے احسن کو دیکھا۔ان کے چہرے کو سنجیدہ دیکھ کر وہ پریشان سی ہو گئی ۔

''لیجیے ۔'' اس نے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے بازو ان کی طرف بڑھا دیا۔ بس ذرا سی تکلیف ہوئی اور اس کے بعد سب کچھ ٹھیک تھا۔

''بس اتنی سی بات کے لیے واویلا کر رہی تھیں ۔'' احسن نے سوئی سپرٹ سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے بیٹا بستر پر لیٹے لیٹے اکتا گئی ہے ۔'' آ کا نے چائے میں چینی ڈالتے ہوئے کہا۔

''اچھا بھلا پھرتا تندرست آدمی یوں اچانک بستر پر پڑ جائے تو اکتاہٹ فطری بات ہے ۔'' اس نے مدھم آواز میں کہا۔

چائے پی کر وہ اسے آرام کرنے کے لیے کہتے ہوئے باہر آ گئے ۔

چاند صنوبر کے درختوں کی چوٹیوں پر جھک رہا تھا۔ستاروں کی پلکیں اُس کے نورانی حسن میں ڈوبی ہوئی تھیں۔چاندنی برف کے گالوں کی مانند ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔خنک ہوائیں بھینی بھینی خوشبو اڑاتی پھر رہی تھیں۔

یہ نظارے ان کے لیے نئے نہ تھے۔وہ اکثر چاندنی راتوں میں فطرت کے حسین نظاروں سے محظوظ ہوتے۔لیکن آج وہ ایک عجیب سی تشنگی اور نامعلوم سی خلش محسوس کر رہے تھے۔ڈیزی کے سفید پھول کوئی دلنواز دھن تخلیق کرتے نظر آ رہے تھے۔انہوں نے جھک کر آہستگی سے ان پھولوں کو چھوا۔نرم و نازک پنکھڑیوں والے پھول۔ڈیزی کے ان پھولوں ہی کی طرح نازک اور حسین سا ایک سراپا ان کے خیالوں کی دنیا میں آیا۔چاند کی طرف دیکھا وہ پیکر چاند کی سطح پر بھی تھرکتا دکھائی دیا۔نور میں ڈوبی پہاڑیوں کو دیکھا ہر سمت ایک ہی سراپا رقصاں تھا۔

پریشان ہو اٹھے۔۔۔سر بار بار جھٹکا۔

''یہ سب کیا ہے؟ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟''

کلینک میں بھی کام کرتے ہوئے انہیں کتنی بار اس کا خیال آیا۔آنکھیں بند کرتے ہوئے اضطراری حالت میں انہوں نے بایاں ہاتھ اپنے بالوں میں پھیرا۔سیاہ گھنے بالوں کے سروں کو انگلیوں کی پوروں سے مسلتے ہوئے انہوں نے سوچا یہ کیسی بے چینی ہے؟ کیسا اضطراب ہے؟

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

''اچھا بھلا چلتا پھرتا تندرست آدمی یوں بستر پر پڑ جائے تو اکتاہٹ فطری ہے۔''

''وہ مریض ہے۔تمہاری مہمان ہے۔اس کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے۔'' دل

نے احتجاج کیا۔

باب نمبر:۲۰

نرم نرم تکیوں میں کہنیاں پھنسائے ہاتھوں میں تاش کے پتے پکڑے لبوں پر ملکوتی تبسم کی کرنیں بکھیرے وہ پرشوق نگاہوں سے کبھی اپنے ہاتھوں کبھی میز اور کبھی احسن کے چہرے کو دیکھتی جو سنجیدگی سے کھیل میں مگن نظر آتے تھے۔

احسن نے پتہ پھینکا اور میز پر بکھرے ہوئے باقی پتے اٹھائے۔ بے چینی سے زرغونہ نے پہلو بدلا۔ پلاسٹر چڑھے پاؤں کو آہستگی سے سمیٹا اور قدرے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر احسن اپنی مسکراہٹ ضبط نہ کر سکے۔

وہ پتہ پھینک چکے تھے اب اس کی باری تھی۔ بہت ہی پھرتی دکھائی۔ پتہ احسن کے پتہ پر آ گیا۔

''اس بار پیس آپ کے حصے آئے گی۔'' وہ ادائے ناز سے مسکرائی۔

''حقدار تو ویسے آپ ہی ہیں۔''

اس نے نگاہیں اٹھائیں۔احسن کی آنکھوں میں ہلکا ہلکا تمسخر نمایاں تھا۔

''میرے خیال میں تو آپ زیادہ مستحق ہیں۔''

دل، پیار آنکھوں میں منتقل کر رہا تھا۔

ان کے دل میں جل ترنگ سا بجنے لگا۔

''ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے۔''

اور اس بار پھر زرغونہ ہار گئی۔

''پتوں کو آپ کے ہاتھ زیادہ پسند ہیں۔'' احسن نے لطیف سی چوٹ کی۔

کرسی کی پشت سے سر لگاتے ہوئے وہ اسے دیکھنے لگے۔

وہ پتوں کو اس بری طرح پھینٹ رہی تھی کہ احسن کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

''یہ عتاب ان پر کیوں؟''

''قصور وار یہی تو ہیں۔''

اس کی ہنسی بہت معصوم تھی۔

اپنی نازک ہتھیلی اس نے احسن کی طرف بڑھا دی۔ اس سے پہلے ہر بار وہ پتے میز پر رکھ دیا کرتی تھی۔

احسن نے پتے اٹھائے تو انگلیاں اس کی ہتھیلی سے چھو گئیں۔ اور یہ لمس رگوں میں ایک کیف آور احساس دوڑا گیا۔ زرغونہ کے ہاتھوں میں بھی خفیف سی لرزش ہوئی لیکن جلد ہی اس نے خود پر قابو پا کر پتے بانٹنے شروع کر دیئے۔

اس بار خلاف توقع احسن ہار گئے۔ شاید قصداً اور وہ اتنی خوش ہوئی کہ بڑے پیارے انداز میں کتنی ہی دیر تک تالیاں پیٹتی رہی۔

احسن کچھ دیر تک اس کی مسرت سے محظوظ ہوتے رہے اور پھر نماز پڑھنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلے آئے۔

سات دن بعد پلاسٹر اتار دیا گیا۔ پاؤں اب ٹھیک تھا۔ کمرے میں وہ چند بار چلی۔ کاٹیج سے نکل کر باہر کچھ دور تک گئی۔ کوئی خاص تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ سر کے زخم بھی اب ٹھیک تھے۔ اگلے دن وہ واپس بھی جانا چاہتی تھی۔

اس شام اس نے احسن سے وہ جھیل دکھانے کے لیے کہا جس کی آ کا کتنی ہی بار تعریف کر چکے ہیں۔

''ابھی آپ کو اتنی جلدی اتنا چلنا نہیں چاہئے۔''

انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''کل میرا واپسی کا ارادہ ہے۔ جانے سے قبل میں اسے ضرور دیکھنا چاہتی ہوں۔''

اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

شام کے سات بجے وہ احسن کے ساتھ جھیل دیکھنے جا رہی تھی۔ پاؤں تھوڑی سی مسافت کے بعد ہی درد کرنے لگ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ چال کی تیزی میں سستی آئی تو احسن اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''تکلیف ہو رہی ہے نا۔ اس لیے میں نے آپ کو منع کیا تھا۔''

وہ قدرے پریشان تھے۔

''کچھ اتنی زیادہ نہیں۔ آپ چلیئے۔'' وہ خاصی ضدی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔

''نہیں واپس چلتے ہیں تکلیف بڑھ جائے گی۔'' احسن چلتے چلتے رک گئے۔

''آپ یوں ہی گھبرا گئے ہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

نکھری نکھری چاندنی میں اس نے احسن کے دراز قد کو بغور دیکھا وہ بہت پرکشش نظر آ رہے تھے۔

''مجھے ٹھیک نظر نہیں آ رہی ہیں آپ۔''

ان کا لہجہ الجھا ہوا تھا۔

''سفر شروع کر کے درمیان سے توڑنا میری عادت نہیں۔اور میں راہ کی صعوبت سے کبھی گھبرائی نہیں۔'' اس نے ذو معنی بات کی۔

احسن نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

اور جب چاند چیڑ کے درختوں پر نمودار ہو رہا تھا۔وہ جھیل پر پہنچ چکے تھے۔ہر طرف روشنی کا غبار سا پھیلا ہوا تھا۔اس نے شفاف پانی میں جھانک کر دیکھا۔چاند مسکرا رہا تھا۔نیلے محل سے جھانکتا چاند اور جھیل کی تہہ میں ہنستا چاند۔۔۔اسے کچھ یاد نہ رہا۔ہر چیز پر خواب کا سا گمان ہوتا تھا۔

ماحول کے سحر سے احسن بھی مسحور ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔سرسراتی ہوائیں اور مدہوش کر دینے والی چاندنی عجیب سماں پیدا کر رہی تھی۔ایک بڑے سے پتھر سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے بے اختیار زرغونہ کی طرف دیکھا۔وہ جھیل میں پتھر پھینک رہی تھی۔کچھ دیر اس کی طرف دیکھتے رہے اور پھر دھیمی آواز میں خود سے بڑبڑائے۔

''اے حسین لڑکی! تم جسے وقت کی لہروں نے چند ساعتوں کے لیے میرے قریب تر کر دیا ہے۔کل یہی لہریں تمہیں مجھ سے دور لے جائیں گی۔تمہاری آنکھوں کی پہنائیوں میں پیار کے جو چراغ جگمگائے ہیں تم کیا سوچتی ہو میں ان کی چمک سے بے بہرہ ہوں۔نہیں لیکن میں جانتا ہوں ان کی چمک عارضی ہے۔شہروں کی گہما گہمی اور پر آسائش زندگی اسے بہت جلد بجھا دے گی۔زرغونہ زندگی صرف نغموں کا نام نہیں۔یہ ایک کڑی اور ابدی حقیقت ہے۔اور یہاں تو ویسے بھی کانٹے ہی کانٹے ہیں۔تم پھولوں جیسا وجود رکھنے

والی لڑکی ان کانٹوں کو کہاں برداشت کرو گی؟اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں اور تم اپنے اپنے راستے پہچان لیں۔''

ان کی آنکھیں بند تھیں۔زرغونہ نے چند بار ان کی طرف دیکھا۔گھٹن سی محسوس ہوئی۔یہ اتنا خوبصورت سماں یوں آنکھیں بند کر کے پڑے رہنے کا تو نہیں۔وہ تو ان کی زبان سے چند میٹھے بول سننے کی آرزومند تھی۔

ماحول کا حسن لحہ بہ لحہ بڑھتا جا رہا تھا۔رات گہری ہو رہی تھی۔احسن واپس جانے کے ارادے سے اٹھے۔

''اب واپس چلنا چاہیے۔'' وہ اس کے قریب چلے آئے۔

''چلیے۔''

وہ پتھروں پر احتیاط سے قدم جماتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ایک گہری نظر اس نے احسن پر ڈالی۔اس انسان کی دید کی تمنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بن کر رہ گئی تھی۔احسن چاند میں جانے کس چیز کے متلاشی تھے۔نگاہیں مسلسل اس پر جمی تھیں۔اور زرغونہ کی آنکھوں میں پیار کے جگمگاتے ستارے ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگے۔لبوں پر سنجیدگی اور بھی گہری ہوگئی۔بغیر کچھ کہے وہ کنگ سے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہے۔زرغونہ کے گلے میں جیسے کوئی پھانس اٹک گئی تھی جس کی چبھن ہر لمحے شدید ہوتی جا رہی تھی۔وہ اس کے پاس نہیں بیٹھے تھے۔انہوں نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔سارا وقت پتھر سے ٹیک لگائے نیم دراز سے لیٹے رہے۔

اس کی رفتار بہت سست تھی۔پاؤں میں اب شدید درد ہو رہا تھا۔بے چینی میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

احسن سے اس کا اضطراب پوشیدہ نہ تھا۔سمجھ رہے تھے کہ شدید کرب سے دوچار

ہے۔اس صورت میں گھر پہنچنا بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔وہ مہمان تھی ۔بیمار بھی تھی۔

''آپ کے پاؤں میں تکلیف ہے۔اگر محسوس نہ کریں تو میرا سہارا لے لیں۔''

زرغونہ کی نگاہیں اوپر اٹھیں۔بھکی بھکی چاندنی میں اس نے ان آنکھوں میں جھانکا۔ہمیشہ کی طرح وہاں خلوص اور اپنائیت کا گہرا احساس تھا۔

خودداری نے سر اٹھایا کچھ سوچا۔آنکھوں میں غرور سا چھا گیا۔

''شکریہ! میں ٹھیک ہوں۔''

''آپ بہت ضدی ہیں،کیا ایک ہفتہ پھر بستر پر پڑنے کا ارادہ ہے۔''

انہوں نے اسے بازوؤں سے تھام لیا۔

اس کے بازو خود بخود ان کی گردن میں حمائل ہو گئے۔سر بے اختیار ان کے شانوں پر آ گیا۔

خود کو ان کے اتنے قریب پا کر وہ بے خود سی ہو گئی۔

ہلکی پھلکی زرغونہ احسن کے بازوؤں میں سمٹ آئی تھی۔

وہ بھی بوکھلا سے گئے۔جسمانی لمس خون میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔

اپنے شانوں پر جھکا ہوا خوبصورت چہرہ گلے میں حمائل سڈول سفید بازو۔آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔قدموں تلے ریت ہی ریت محسوس ہوئی۔پاؤں لڑکھڑاتے محسوس ہوئے۔اپنے سامنے دیکھا۔اور بس اسی لمحے وہ ریت کے دلدل سے نکل کر اس جگہ آ چکے تھے جہاں سخت مٹی تھی۔جس پر گرنے کا اندیشہ باقی نہ رہتا۔

زرغونہ مدہوش سی ان کے ساتھ ساتھ قدم اٹھائے چلی جا رہی تھی۔اونچی نیچی پگڈنڈیاں نیلے آسمان کے بے کراں سمندر میں ستاروں کی نقرئی کشتیاں،روشن مہتاب،بھینی بھینی خوشبو اور اپنے بالکل قریب پیاری اور دل میں بسنے والی ہستی۔سب کچھ کتنا حسین تھا۔

احسن کا جی چاہا وقت کی ان ساعتوں کے پاؤں میں زنجیریں پہنا دیں۔ کائنات کو رک جانے کے لیے کہہ دیں اور خود یوں ہی چلتے چلتے ختم ہو جائیں۔

باب نمبر:۲۱

لمبے لمبے سیاہ بالوں کو اس نے تیزی سے سمیٹا۔کھلا دوپٹہ شانوں پر پھیلایا۔اٹیچی کیس کا جائزہ لیا۔چیزیں گڈمڈ سی ہو رہی تھیں۔انہیں ترتیب سے رکھنے کے خیال سے باہر نکالا۔ابھی چند کپڑوں کو ہی تہہ کیا تھا کہ طبیعت میں وحشت سی ہونے لگی۔یوں جیسے دل الٹنا شروع ہو جائے۔بیزاری سے اس نے یوں ہی ہر چیز اٹیچی کیس میں ٹھونس لی۔

خالی خالی نگاہ کمرے میں چاروں طرف دوڑائی۔یہاں کئی دن ٹھہری تھی اور اب واپس جا رہی تھی۔دل دھیرے دھیرے سلگ رہا تھا۔ہلکا ہلکا دھواں فضا میں پھیل رہا تھا۔

وہ اٹیچی کیس اٹھائے کمرے سے باہر نکل آئی۔

آکا نے اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔اس کے سر اور پیشانی پر بوسے ثبت کرتے ہوئے وہ بے اختیار رو دیئے۔اس کے بازوؤں میں سمٹی اور سینے میں منہ چھپائے وہ خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

پیار و محبت کے لیے تو اس کی تشنہ روح ہمیشہ بھٹکتی رہی تھی۔یہ پیار تو اسے ماں

سے بھی نہ مل سکا تھا۔

احسن صبح چند مریضوں کی وجہ سے جلدی کلینک چلے گئے تھے جاتے جاتے آ کا سے کہہ گئے کہ زرغونہ کی روانگی کے وقت انہیں اطلاع بھیج دی جائے وہ آ جائیں گے۔ ملازم بلانے کے لیے جانے لگا تو زرغونہ نے روک دیا کہ وہ جاتے ہوئے راستے میں مل لے گی۔ کیا ضرورت ہے بلانے کی۔ وہ کچھ دل برداشتہ سی تھی۔

''گلباز کو جانے دیا ہوتا بیٹے!''

''نہیں ان کے وقت کا ضیاع ہوگا۔ میں وہیں مل لوں گی۔''

''مجھے بھول تو نہ جاؤ گی؟'' انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''آپ کو۔۔۔؟'' موٹے موٹے آنسو آنکھوں سے ڈھلکنے لگے۔

''آپ کو بھولنا میرے بس کی بات نہیں۔''

''پھر کب آؤ گی بیٹے؟''

''کیا کہہ سکتی ہوں؟''

وعدہ کس بل بوتے پر کرتی۔ احسن تو بالکل خاموش تھے بن بلایا مہمان ہر بار تو نہیں بنا جا سکتا مجبوری ختم ہو چکی تھی۔

''نہیں تمہیں ضرور آنا ہے۔ اچھا اگر تم نہیں آؤ گی تو مجھے اپنا پتہ دے جاؤ میں تمہارے پاس شہر آؤں گا۔''

''اچھا میں آؤں گی۔'' وہ بوکھلا سی گئی۔

متعدد بار دوبارہ آنے کا وعدہ لے کر انہوں نے اس کی پیشانی پر الوداعی بوسہ دیا۔ چلتے چلتے اس نے کتنی بار پلٹ پلٹ کر دیکھا۔ دل ڈوب رہا تھا۔

آ کا ابھی تک وہیں کھڑے تھے۔ ایک اونچی پہاڑی کی اترائی نے انہیں ایک

دوسرے کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔اس نے ایک بار پھر اشک بار آنکھوں سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔دل وہیں گر جانے کو چاہا۔

گلباز کافی آگے جا چکا تھا۔رک کر انتظار کرنے لگا۔قریب آئی تو اس نے ادب سے پوچھا۔

''آپ کلینک چلیں گی؟''

وہ دوراہے پر کھڑی تھی۔جہاں سے ایک راستہ بستی کی طرف جاتا تھا اور دوسرا شہر کی طرف۔

''کیا ضرورت ہے انہیں یہیں بلا لاؤ۔''

نوکر نے سامان وہیں رکھ دیا اور خود ڈھلوانی راستے پر اترنے لگا۔

ٹانگیں کانپنے لگیں تو وہ بڑے سے ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔

مایوسیوں کے اندھیروں میں بھٹکتے بھٹکاتے روشنی اگر ملی بھی تو کتنی دیر کے لیے؟

ترستی آنکھیں ابھی لذت دید سے پوری طرح سیراب بھی نہ ہو پائی تھیں کہ پھر خشک ہو جائیں گی۔

یہ سزائیں کبھی پیچھا نہ چھوڑیں گی۔جونکوں کی طرح خون کا ایک ایک قطرہ جب تک نہ چوس لیں گی تب تک چین کہاں؟

سر گھٹنوں میں دیئے وہ رو رہی تھی۔خشک بال ہوا سے اڑ رہے تھے۔

قدموں کی آہٹ پر اس نے نگاہیں اٹھائیں۔احسن اس کے سامنے کھڑے تھے۔بکھرے بکھرے بال اور ان کے درمیان اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ۔۔۔احسن تڑپ ہی تو اٹھے۔

''زرغونہ!'' انہوں نے پہلی مرتبہ اس کا پورا نام پکارا۔آواز بوجھل تھی۔وہ اس

کے قریب ہی بیٹھ چکے تھے۔

ان کا اتنے پیار سے نام لے کر پکارنا اس کے رہے سہے ضبط کو ختم کر گیا۔ اپنائیت کا احساس دکھی دل کو اور بھی دکھی بنا گیا۔

''زرغونہ قدرت نے تمہیں کانٹوں پر چلنے کے لیے تخلیق نہیں کیا۔''

انہوں نے شفقت سے اپنا ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیا۔

جھکے سر کو اٹھایا۔ احسن کی طرف دیکھا۔ اس دید میں ایک شکایت تھی، ہونٹوں پر ایک آہ ابھری اور ختم ہو گئی۔ اس آہ میں سسکتی پکار تھی۔ جسے احسن کے کان نہ سن سکتے تھے۔

اس نے آنسو پونچھ ڈالے اور کھڑی ہو گئی۔ نگاہیں ملیں۔

احسن کی آنکھوں میں روشنی تھی۔

''میں آپ کی شکر گزار ہوں۔''

اس کی آنکھوں میں پھر آنسو امڈ آئے۔

''لیکن کس بات کے لیے؟''

''اتنی تکلیف جو میں نے آپ کو دی۔''

''یہ میرا فرض تھا اور اس کے لیے شکریہ کا کوئی سوال ہی نہیں۔''

''اب کہاں جانے کا ارادہ ہے؟''

''اپنے بنگلے پر جاؤں گی اور وہاں سے گھر۔'' اس کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔

''اچھا خدا حافظ!''

اس نے بغیر احسن کی طرف دیکھے قدم آگے بڑھا یا۔

اور عین اس لمحے انہیں محسوس ہوا کہ وہ جو لوگوں کی دکھی زندگیوں کو خوشیوں سے ہمکنار کرنے کی جدوجہد میں تن دہی سے مصروف ہیں خود انہیں بھی خوشیوں کی ضرورت

ہے۔اور وہ برستی آنکھوں والی لڑکی ان کے دل کی گہرائیوں میں بہت نیچے اتر چکی ہے۔

تب گھمبیر سی آواز میں انہوں نے وہ کہہ دیا جسے وہ کہنا نہ چاہتے تھے۔

''خدا حافظ زرغونہ! یہاں کی ہر چیز تمہارا انتظار کرے گی۔شہر کی گہما گہمی سے کبھی فرصت ملے تو ضرور آنا۔''

الفاظ کانوں کی راہ سے دل میں اتر چکے تھے۔

''شہروں کی گہما گہمی۔۔۔۔'' وہ بڑبڑائی۔

پلٹ کر دیکھا۔احسن وہیں کھڑے تھے۔

جی چاہا ان کے سینے سے لگ جائے۔ان کے شانوں پر اپنا سر رکھ دے ان کی گردن اپنے بازوؤں میں لے لے اور ان سے وہ سب کچھ کہہ دے جو وہ کہنا چاہتی ہے لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

وہ نیچے اتر گئی اور رومال سے آنسو صاف کرتی گئی۔

''میں خوش ہوں کہ میں نے تمہاری محبت پالی ہے۔''

جھرنے کے پانی سے منہ دھوتے ہوئے جانے یہ جملہ کتنی بار اس نے خود سے کہا۔

باب نمبر:۲۲

شیشم کے درخت کے موٹے تنے سے ٹیک لگائے وہ اکڑوں بیٹھی تھی۔دونوں جوتے اس سے فرلانگ پرے گھاس پر پڑے تھے۔ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنوں کی تمام روشنی اسے اپنے چہرے پر پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ایک ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر بیٹھی سمیعہ کا سانولا چہرہ اسے کچھ زیادہ ہی گہرا نظر آ رہا تھا۔ہاتھ کی اوٹ بنا کر اس نے چہرے کو سورج کے ایک طرف کر لیا۔

''یہ تم کہہ رہی ہو سمیعہ؟'' اس کی آواز میں گہری اداسی گھلی ہوئی تھی۔

''کچھ غلط نہیں کہا۔تم جیسی ٹھوس کردار کی لڑکی۔۔اس سے بڑھ کر انسانی کردار کی عظمت اور کیا ہو سکتی ہے۔''

''اپنے پاؤں پر آپ ہی کلہاڑا مارنے کو میرا جی نہ چاہا۔میں نے انہیں بڑی مشکل سے پایا تھا۔اتنی جلدی کیسے کھو دیتی؟''

''لیکن تم یہ بھول رہی ہو کہ یہ راز ایک دن فاش ہونا ہی ہے۔''

''تمہاری شہرت عروج پر ہے۔کب تک چھپاؤ گی؟''

''جب تک چھپایا جا سکا۔اس کے بعد ان کے نقش پا میری منزل ہوں گے۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''میرا خیال میڈیکل کرنے کا ہے۔ڈاکٹر بن کر میں بھی اسی مسلک کو اپناؤں گی جوان کا ہے۔ممکن ہے انہیں میری وفاداری اور پارسائی کا یقین آ ہی جائے۔اور اگر ایسا نہ ہوا تو بھی یہ فخر کیا کم ہے کہ میں نے ایک عظیم انسان سے پیار کیا۔''

''بعد میں فلمی دنیا سے کنارہ کشی کا ارادہ ہے تو ابھی سے یہ قدم کیوں نہیں اٹھاتیں؟''

''نہیں سمیعہ! یہ دھوکا ہوگا اور حقیقت پھر حقیقت ہے۔لاکھ اس کے چہرے پر پردے گراؤ۔یہ بے نقاب ضرور ہو جاتی ہے۔''

''زرغونہ کیا تم اپنے موجودہ طرز عمل سے مطمئن ہو؟ کیا یہ دھوکا نہیں؟'' سمیعہ نے طنزیہ استفسار کیا۔

''مجبوری ہے۔عارضی سا دھوکا ہے، دائمی نہیں۔''

''کیا فرق پڑتا ہے؟ بات تو ایک ہی ہے۔''

''تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ایک غیرت مند کبھی یہ برداشت کر سکتا ہے؟ تم تو اس دنیا کی فرد ہو۔سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ کہہ رہی ہو۔اپنے گھر والوں کو ہی دیکھ لو۔سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں لیکن دو تین کو چھوڑ کر بقیہ لوگوں کا رویہ کیسا ہے؟ اور انہیں میں کس طرح یہ داستان سنا دیتی جن کا کردار چمکتے آئینے کی طرح ہے جس پر ایک بھی دھبہ نہیں۔''

''چچی اماں کے طرز عمل سے اگر تمہیں تکلیف پہنچی ہے تو میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔زرغونہ وہ عورت قابل معافی ہیں۔لیکن میرا خیال ہے میرے گھر والوں

کارویہ تمہارے ساتھ انتہائی مشفقانہ ہے۔''

''میں ان کی اس محبت کے لیے ممنون ہوں۔''

''دوبارہ جانے کا کب ارادہ ہے؟'' سمیعہ نے ماحول کی تلخی کو کم کرنے کے لیے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''بہت جلد'' زرغونہ بھی مسکرا دی۔

''کیا ضرورت تھی واپس آنے کی؟ وہیں رہ جاتیں۔ دو بول کسی قاضی کو بلوا کر پڑھوا لیے ہوتے۔''

''اے کاش ایسا ہو سکتا'' دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''ہاں سمیعہ مجھے یہ پوچھنا تو یاد ہی نہیں رہا تم انہیں کیسے جانتی ہو؟''

''بھئی انہیں کون نہیں جانتا۔ اس شہر کے ایک چوتھائی حصے اور اس کے گردونواح میں پھیلی ہوئی سینکڑوں مربع اراضی کے مالک ہیں۔ وہ شہر کے امیر ترین آدمی ہیں جو پہاڑوں میں بیٹھے غرباء کی خدمت کر رہے ہیں۔''

''تم نے انہیں دیکھا ہے؟'' زرغونہ نے پوچھا۔

''بس سنا ہوا ہے۔ میں نے تم سے بھی تو ایک دو بار ذکر کیا تھا۔''

''میں نے توجہ نہیں دی یقیناً کیا ہو گا۔''

''تم نے وہاں اخبار وغیرہ نہیں پڑھا؟''

''نہیں بس خبریں سن لیا کرتی تھی۔''

''دراصل وہ شہری زندگی سے بالکل لاتعلق ہیں۔ صبح و شام مریضوں میں کھبے رہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تمہیں پہچان نہیں سکے۔''

''لیکن انہوں نے تو میرے بارے میں بھی مجھ سے کچھ دریافت نہیں کیا۔''

''کم گو معلوم ہوتے ہیں غالباً۔''

''ہاں کسی حد تک۔''

''میں نے سنا ہے رنگت خاصی سانولی ہے۔ دراز قامت اور صحت مند جسم کے مالک ہیں۔''

''سمعیہ ان کی آنکھیں۔۔۔''

زرغونہ اس کے شانوں پر جھک آئی۔

''سچ اتنی خوبصورت ہیں کہ ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔''

''ڈوب تو چکی ہو۔'' سمیعہ نے ہنستے ہوئے جملہ پورا کر دیا۔

''چلو اٹھو سورج ڈوب رہا ہے۔ مجھے گھر جانے دو۔'' اُس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھئی کھانا کھائے بغیر نہیں جا سکتی ہو تم۔''

''نہیں زرغونہ امی فکر مند ہوں گی۔''

سمیعہ کو رخصت کرنے کے بعد جب وہ اندر آئی ممتاز بائی پیشانی پر شکنیں لیے برآمدے میں چکر لگا رہی تھی۔

''مجھے تمہارا سمیعہ کے ساتھ ملنا جلنا بالکل پسند نہیں۔''

''مجبوری ہے۔'' اس نے ایک نگاہ غلط انداز ماں پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔

''زرغونہ!'' ممتاز بائی غصے سے لہرائی۔

''کیا کہنا ہے۔'' اس نے گردن موڑ کر حد درجہ بے رخی سے کہا۔

''تمہارے انداز میں اتنی سرکشی اور رعونت کیوں ہے۔ جب میں کچھ کہتی ہوں سنتی کیوں نہیں؟''

ممتاز بائی پل بھر کیلئے رکی اور پھر بولی۔

''میں نے کتنی بار کہا ہے کہ مجھے اس کا اپنے گھر آنا پسند نہیں۔''

''ٹھیک ہے میں اس کے گھر چلی جایا کروں گی۔'' زرغونہ نے ٹھنڈی آگ لگائی۔

''چین نہیں آتا تمہیں اس کے بغیر؟'' ممتاز بائی گرجی۔

''کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' غایت اطمینان سے کہا گیا۔

''زرغونہ اپنا طرزِ عمل بدلو۔رسی جل جاتی ہے لیکن بل نہیں جاتے۔تم جانتی ہو میں ممتاز بائی ہوں۔''

''اور میں کون ہوں؟'' تیکھی چتون سے اس نے ماں کو گھورا۔

ممتاز بائی بپھر اٹھی۔سرلا بائی کو پکارا۔لیکن وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

''تم دیکھتی ہو سرلا دماغ خراب ہوتا جا رہا ہے۔بات کرو تو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔''

''چلو چھوڑو اس قصے کو۔کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

کیا کرتی وہ بیچاری بھی۔یہ تو تو میں میں تو اس گھر کا مقدر بن چکی تھی۔

باب نمبر:۲۳

کیلنڈر پر تاریخ بدلتے ہوئے بے اختیار اُن کے ہاتھ رک گئے۔روشن آنکھوں میں اداسی چھانے لگی۔تمہیں آج یہاں سے گئے ہوئے تین ماہ ہو رہے ہیں۔تین ماہ نوے مکمل دن۔مجھے تمہارا انتظار کیوں؟ میں تمہیں بھول کیوں نہیں جاتا؟ شبنمی روتی آنکھیں کیوں میرے ذہن پر ہمہ وقت مسلط رہتی ہیں۔؟

وہ کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ہاتھ پشت پر تھے۔

''احسن رضا اپنے آپ کو سمجھاؤ۔ویرانوں میں جھانکنا کون پسند کرتا ہے۔''

انہوں نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی۔

جس میٹھی میٹھی لذت سے وہ آشنا ہوئے تھے اب وہ درد کی ٹیسوں میں بدلتی جا رہی تھی۔ایک گہری خلش انہیں ہمہ وقت بے چین کیے رکھتی۔کلینک میں کام کرتے کرتے جب بھی انہیں زرغونہ کا خیال آتا وہ تڑپ اٹھتے۔

دل کبھی کبھی سریلی لے میں ایک دل نواز دھن چھیڑ دیتا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ سب کچھ بھول کر اس میں کھو جاتے۔ دل کے بربط کے تاروں پر جو نغمہ بجتا اسے سنتے رہتے۔ لیکن یہ طلسم جلد ہی ٹوٹ جاتا۔ گزرتے دنوں کے دامن سے لپٹی ناامیدیاں روشن خوابوں کو نگلتی جا رہی تھیں۔

''میں نے بیٹھے بٹھائے یہ کیا روگ لگا لیا ہے؟'' وہ خود سے الجھ پڑے۔

وقت دیکھا۔ آٹھ بج رہے تھے۔ علی نے میز لگا کر انہیں اطلاع دی۔ آ کا گزشتہ اتوار سے اپنے آبائی گاؤں گئے ہوئے تھے اور گلباز بیمار تھا۔ کھانا علی تیار کرتا۔ ہر چیز بدمزہ سی ہوتی لیکن وہ ذائقوں کی طرف کم ہی توجہ دیا کرتے تھے۔ کھانا وہ زندہ رہنے کے لیے ہی کھایا کرتے۔ کلینک پہنچے۔ بے شمار مریض ان کے انتظار میں تھے انہیں دیکھتے ہی ان کی بجھی بجھی آنکھوں میں زندگی مسکرانے لگی۔ ایک ایک مریض کو وہ کس قدر توجہ اور درد سے دیکھتے۔ چار بجے تک خاصا مصروف رہے پھر گھر آ گئے۔

موسم خنک تھا۔ رات بھر بارش ہوتی رہی تھی۔ اس وقت گرم کمبل کو گردن تک لپیٹے وہ پلنگ کی پٹی پر سر رکھے یوں ہی کچھ سونے اور کچھ جاگنے کی کیفیت میں تھے۔

کمرے کا دروازہ آہستگی سے کسی نے ہلکا سا دھکا دے کر کھولا۔ پردہ اٹھایا اور انہیں یوں نیم دراز سا لیٹا دیکھ کر آنے والے کے لبوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ ابھری۔ ایسی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر شاید پہلی بار نمودار ہوئی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے اس نے کچھ سوچا۔ آنکھوں میں خوشی کے دیپ سے جل اٹھے۔

بغیر آواز پیدا کیے وہ پنجوں کے بل چل کر آگے بڑھی اور اپنے دونوں ہاتھ ان کی آنکھوں پر رکھ دیے۔

وہ یک دم چونک اٹھے۔ اپنی چھبیس سالہ زندگی میں وہ کبھی ایسی لطیف چھیڑ چھاڑ

سے دوچار نہ ہوئے تھے۔حیرانی بجا تھی۔

لیکن حیرت اور مسرت کا درمیانی وقفہ صرف ایک لمحے کا تھا۔فضا میں بہت مانوس کن خوشبو بکھری ہوئی تھی۔اپنے ہاتھوں کو اس کے ہاتھوں پر رکھتے ہی وہ فوراً پہچان گئے تھے کہ اس انداز میں ان کی آنکھیں زرغونہ کے سوا کون بند کرسکتا ہے۔دل میں دھڑکنوں کے طوفان اٹھے۔

''زرغونہ!'' ان کی آواز محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اپنے ہاتھ زرغونہ نے ان کی آنکھوں سے جونہی ہٹائے، احسن بے اختیار اس کی طرف مڑ گئے۔

سیاہ کارڈیگن اور اس پر سیاہ دوپٹے میں لپٹا ہوا اس کا چہرہ کس قدر دل فریب نظر آرہا تھا۔

''زرغونہ تم؟'' ان کے چہرے پر سنجیدہ وقار تھا۔آنکھیں ایک ایک راز اگل رہی تھیں۔کچھ شکوہ کچھ خوشی اور کسی حد تک حیرت ہر احساس واضح تھا۔

''بیٹھو گی نہیں؟'' احسن نے مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''آپ ٹھیک ہیں نا؟'' اس نے قریب پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں کیسا نظر آتا ہوں؟'' احسن مسکرائے۔مجبوب سی ہنسی زرغونہ ہنس دی۔

''آکا مجھے کہیں نظر نہیں آئے۔''

''ان کے بھانجے کی طبیعت خراب تھی اسے دیکھنے کے لیے وہ اپنے آبائی گاؤں گئے ہوئے ہیں۔''

علی چائے بنا لایا۔

چائے پیتے ہوئے یوں ہی پوچھ بیٹھی۔

''کیا آ کا مجھے یاد کرتے تھے؟''

''زرغونہ تمہیں یہاں کی ہر چیز یاد کرتی تھی۔''

کپ اس کے ہاتھ میں لرز گیا۔ نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ ان شفاف آنکھوں میں حقیقی چاہت کا رنگ تھا۔

اسی محبت کی وہ متلاشی تھی۔ ایسے ہی خلوص کی وہ متمنی تھی اور اس نے یہ سب کچھ پا لیا تھا۔

لیکن کتنی مدت کے لیے؟

دل سلگ اٹھا۔ قریب ہی تھا کہ آگ بھڑک اٹھتی۔ لیکن وہ خود پر قابو پا چکی تھی۔

''مجھے اپنی زندگی میں اس دن کی کبھی توقع نہ تھی معبود! تو نے مجھے جو کچھ دیا ہے میں اس پر قانع ہوں۔ مسرت کے ان لمحات کو میں از خود سوگواری میں نہیں بدلوں گی۔ مسکراؤں گی۔ قہقہے لگاؤں گی اور جیون بھر کے لیے حسین یادیں سمیٹ لوں گی۔''

گھنی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھا اور ''سوائے آپ کے۔'' کہتے ہوئے کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

احسن کو اپنے اردگرد خوشیوں کے سینکڑوں مہتاب مسکراتے محسوس ہوئے۔ جان ہی نہ سکے کہ ابھی ابھی ان پر کوئی طوفان بھی آیا تھا۔

''زرغونہ پلنگ پر آ جاؤ۔ تمہیں سردی لگ رہی ہوگی۔'' احسن نے بائیں طرف سمٹتے ہوئے مشفقانہ لہجے میں کہا۔

''نور'' انہوں نے دوسرا کمبل منگوانے کے ارادے سے اسے آواز دی۔

''بھئی آتش دان میں کوئلے جلاؤ اور کمبل ایک اور دے جاؤ۔''

رخ پلٹ کر زرغونہ کی طرف دیکھا۔ وہ متذبذب کے سے عالم میں تھی۔

''کیابات ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

زرغونہ نے ان کی طرف دیکھا۔وہ یک دم سنجیدہ ہو گئے تھے۔اوراگلے ہی لمحے وہ پلنگ پر آچکی تھی۔

غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔پریشان تھی کہ اس پر یہ تذبذب کا عالم کیوں طاری ہوا؟ کیا ابھی بھی انہیں پرکھنے کی ضرورت تھی۔نادم نادم سی جھکی جھکی آنکھیں اٹھانے کی ہمت نہ پارہی تھی۔

نورکمبل لے آیا تھا۔اسے کھول کراحسن نے اس پرڈال دیا۔

''اچھی طرح خودکولپیٹ لو۔سردی کافی ہے۔''

''اب مجھے بتاؤ کہ تم کیسے آئی ہو؟''

''میں'' اس کی آنکھیں شوخی سے چمکیں۔

''آپ سے ملنے کے لیے۔''

وہ مطلب سمجھتی تھی۔بس ذرامحظوظ ہونامقصود تھا۔

''کیاثبوت ہے تمہارے پاس؟'' احسن نے ہنستے ہوئے چوٹ کی۔

''اتنے بڑے ثبوت کے ہوتے ہوئے کسی اورثبوت کی ضرورت نہیں۔'' اس نے احسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگھٹنوں میں چھپالیا۔

ہنسی سے اس کا سارا وجودلرز رہا تھا۔

اس دلچسپ مذاق سے احسن نے بھی لطف اٹھایا۔

''تم نے مجھے بتایانہیں زرغونہ۔۔'' کچھ دیر بعدانہوں نے دوبارہ استفسار کیا۔

''میں بنگلے سے نوکر کے ساتھ یہاں آئی ہوں۔''

''گھروالوں نے نہیں پوچھا کہ اس موسم میں پہاڑ پر کیا لینے جارہی ہو؟''

''کیا پوچھتے؟'' اس کے لہجے میں یک دم تیزی آگئی۔

اور انہیں یہ سمجھنے میں قطعی دقت نہ ہوئی کہ وہ ان لڑکیوں میں سے ہے جو گھر والوں کو ناک چنے چبواتی ہیں۔اور ہمیشہ من مانی کرتی ہیں۔

''اچھا اب تم تھوڑی دیر آرام کرو۔کافی تھک چکی ہو۔نو بجے کھانا کھائیں گے۔'' احسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

دروازے تک گئے۔گرم نائٹ گاؤن کی ڈوری مضبوطی سے باندھتے ہوئے انہوں نے رخ پھیرا۔

''زرغونہ تمہیں بھوک تو زیادہ محسوس نہیں ہو رہی ہے؟''

''بالکل نہیں! میں صرف تھوڑی دیر سونا چاہتی ہوں۔''

نو بجے نوکر نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی تو احسن زرغونہ کو جگانے کے لیے کمرے میں آئے۔وہ گہری نیند سو رہی تھی۔سر کہیں تھا اور ٹانگیں کہیں۔اسے بچوں کے سے انداز میں سوتے دیکھ کر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔جگانا مناسب نہ سمجھا۔

کھانا کھاتے ہوئے بھی وہ اس کے متعلق سوچ رہے تھے۔

''بہت کمسن اور معصوم ہے۔''

اور صبح جب نیند کے خمار سے لبریز آنکھیں کھلیں تو ایک مانوس آواز کانوں میں شہد گھول رہی تھی۔آواز کی نغمگی اور کلام کا ترنم سحر آفریں تھا۔وہ دم سادھے چند لمحوں تک آنکھیں بند کیے سنتی رہی۔پھر کسی سحر زدہ انسان کی طرح اپنی جگہ سے اٹھی۔باتھ روم میں جا کر پانی کے چند چھپکے منہ پر ڈالے۔سر پر دوپٹہ ٹھیک طرح اوڑھنے کے بعد وہ احسن کے کمرے میں داخل ہوئی۔

احسن تلاوت ختم کرنے کے بعد تفسیر دیکھ رہے تھے۔اور جب وہ ان کے بالکل

قریب جا کر بیٹھ گئی تب وہ چونکے۔اسے دیکھا۔

سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے نگاہوں میں عقیدت لیے اس لڑکی پر انہیں ہمیشہ سے کہیں زیادہ پیار آیا۔شفقت سے مسکرائے۔

''طبیعت ٹھیک ہے ما زرغونہ! رات تم کھانا کھائے بغیر ہی سوگئیں۔''

لیکن اس نے ہر بات نظر انداز کرتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

''آپ نے کلام پاک پڑھنا بند کیوں کر دیا؟ میں تو سننے کے لیے آئی ہوں۔''

اس کی آنکھوں میں شوق کی ایک دنیا امنڈی ہوئی تھی۔

''تم خود کیوں نہیں پڑھتی ہو؟''

اس کا اتنا بے پایاں شوق دیکھ کر انہیں یک گونہ مسرت سی ہوئی۔

''مجھے پڑھنا نہیں آتا۔'' اس کے لہجے میں تڑپ تھی۔

احسن کے چہرے پر کرب سا نمودار ہوا۔

''مذہب سے لاتعلقی اونچے طبقے کے لیے فخر کا باعث بنتی جارہی ہے۔بچوں کو دینی تعلیم سے روشناس کرانے کو ایک عار سمجھا جارہا ہے۔''

انہوں نے دکھ سے سوچا اور زرغونہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''اگر تمہیں پڑھنے کا شوق ہے تو میں تمہارا یہ شوق ضرور پورا کروں گا۔چلو آؤ اب ناشتہ کرو تم نے رات بھی کچھ نہیں کھایا۔

کھانے کی میز پر وہ حد درجہ خلوص اور پیار سے اسے چیزیں دیتے رہے اور کھانے پر اصرار کرتے رہے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر زرغونہ نے کمرے میں آکر اپنا اٹیچی کیس کھولا۔خوبصورت چاکلیٹی کارڈیگن نکالا۔بازو پر ڈال کر عمیق جائزہ لیا یہ اس نے خود بنا تھا۔اپنے احسن کے

لیے ۔اور وہ اسے دینا نہیں خود اپنے ہاتھوں سے پہنانا چاہتی تھی ۔ایک ایک خانے کی بنائی کرتے وقت جو محبت اس نے ان میں سموئی تھی اس محبت کو ان کے سینے پر پھیل جانے کے بعد دیکھنا چاہتی تھی ۔

لیکن کچھ ہچکچاہٹ بھی تھی ۔

''زرغونہ!'' احسن نے پکارا۔

''جی!'' اس نے سویٹر بستر پر رکھا اور کود کر تقریباً بھاگتی ہوئی ان کے کمرے میں گئی ۔اس کے ''جی'' کہنے کا انداز احسن کو اتنا میٹھا اور پیارا لگا یوں محسوس ہوا جیسے یہ آواز ان کے دل کی دھڑکنوں میں سے ہی پیدا ہوئی ہو۔

''آپ نے مجھے آواز دی تھی ۔'' اس نے اپنی لانبی پلکیں تیزی سے جھپکائیں ۔

اس نے ابھی تک نہ کپڑے بدلے تھے اور نہ ہی بالوں میں کنگھی کی تھی ۔گھنے سیاہ بال شانوں پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے ۔سلوٹیں پڑا پاجامہ مسلی ہوئی اے ناپ شرٹ سیاہ کارڈیگن ۔لیکن وہ اس حالت میں بھی کتنی پیاری نظر آرہی تھی ۔

''میں سوچ رہا ہوں تم یہاں تنہا پریشان تو نہیں ہو جاؤ گی ۔کلینک چلنا چاہتی ہو؟''

''میں کہیں جانا نہیں چاہتی ۔مجھے یہاں سکون ملتا ہے ۔''

وہ کلینک جانے کے نام پر گھبرا گئی تھی ۔

اس کی اس بات سے احسن بھی مطمئن ہو گئے ۔کلینک وہ اسے لے کر جانا بھی نہیں چاہتے تھے ۔ہر طرح کے لوگ آتے تھے ۔

''آج میں تمہارے لیے شہر سے رسائل وغیرہ منگواؤں گا ۔''

''آپ میرے لیے قطعی فکرمند نہ ہوں ۔میرے پاس ڈھیروں رسائل ہیں ۔''

''اچھا خدا حافظ!'' وہ جانے کے لیے کمرے سے باہر نکلا ہی چاہتے تھے کہ زرغونہ کی آواز سن کر پلٹے۔ بہت مدھم آواز میں اس نے پہلی مرتبہ انہیں ان کے نام سے پکارا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ لیکن کومگو کی سی کیفیت میں الجھی ہوئی تھی۔

''زرغونہ! کیا بات ہے؟'' وہ تیزی سے اس کے قریب آئے۔

اس کے ہونٹ کانپ اٹھے۔ چہرہ شدت احساس سے سرخ ہو گیا۔

''زرغونہ!'' احسن نے دوبارہ پکارا۔

''آپ یہاں تھوڑی دیر بیٹھئے!'' اس نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بدقت کہا۔

''لیکن کیوں؟'' احسن نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ ویسے وہ مسکرا رہے تھے۔

''میں نے جو کہا ہے۔'' بمشکل نگاہیں اٹھا کر کہا گیا۔

''لو اگر یہ تمہاری خواہش ہے تو میں بیٹھ جاتا ہوں۔''

تیر کی سی تیزی سے وہ ملحقہ کمرے میں گئی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں شدید سنسناہٹ تھی لیکن اسے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ کارڈیگن اٹھایا۔ اس کے بٹن کھولے جتنا جلدی چاہ رہی تھی اتنی ہی دیر ہوئی جا رہی تھی۔ کمرے میں آئی۔ احسن دروازے کی طرف پشت کیے بیٹھے تھے۔

قریب پہنچ کر لرزتے ٹھنڈے ہاتھوں سے اس نے کارڈیگن احسن کی پشت پر پھیلاتے ہوئے دونوں ہاتھ اس پر رکھ دیئے۔

''احسن میں اسے آپ کو پہنانا چاہتی ہوں۔'' اس کی آواز جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اتنی بے پایاں محبت۔۔۔احسن سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

رخ پلٹ کر دیکھا۔

لرزتے ہاتھ پاؤں، دھڑکتے دل اور کھلی آنکھوں کے ساتھ وہ سامنے کھڑی تھی۔

آنکھوں میں محبت کی قندیلیں جل رہی تھیں۔

وہ کھڑے ہو گئے۔کارڈیگن پشت پر چپکا ہوا تھا ایک بازو آگے جھول رہا تھا۔

''زرغونہ!'' وہ اس کے قریب آ گئے۔

اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے تو چونک اٹھے۔ہاتھ یخ ہو رہے تھے۔

''زرغونہ!'' جانے اس پکار میں جادو تھا یا ان ہاتھوں میں سحر تھا کہ کسی مسحور انسان کی طرح اس کا سر بے اختیار احسن کے سینے سے جا لگا۔

اس مقدس شے کی طرح جس کے لیے انسان حد درجہ محتاط ہوتا ہے کہ اس کی کوئی حرکت اس کی بے حرمتی کا باعث نہ بنے اسی طرح احسن نے آہستگی سے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔شدت جذبات سے ان کے سینے میں طلاطم بپا تھا۔لیکن وہ مکمل ہوش میں تھے۔جھک کر دیکھا اس کی آنکھیں بند تھیں۔چہرے پر گہرا سکون تھا۔

وہ اس کے بالوں سے کھیل رہے تھے۔ہاتھ کے لمس میں گہری محبت اور شفقت تھی۔آنکھیں پاکیزگی کے نور سے چمک رہی تھیں۔

''زرغونہ مجھے سویٹر نہیں پہناؤ گی؟'' آواز میں محبت بھرا اصرار تھا۔

آنکھیں کھول کر احسن کو دیکھا۔جذباتی دنیا سے کچھ ہوش میں آئی۔شرمندگی کا احساس ہوا۔فوراً سمٹ کر ایک طرف ہو گئی۔آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

احسن کارڈیگن پہن چکے تھے۔بٹن بند کرنے کا مرحلہ باقی تھا۔

''زرغونہ! میرا ہاتھ نہیں بٹاؤ گی۔''

جھکی جھکی آنکھوں سے اس نے بٹن بند کیے۔ آگے پیچھے گھوم کر جائزہ لیا۔ ہر لحاظ سے بہت خوبصورت تھا۔ شیریں مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔

''اس پیار کے لیے میں تمہارا ممنون ہوں زرغونہ۔'' انہوں نے اس کے سبک ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا۔

''اب اجازت دو! مریض انتظار میں ہوں گے۔ خدا حافظ۔'' انہوں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

وہ سپنے جنہیں وہ کوٹھے پر بیٹھ کر دیکھا کرتی تھی ان کی تعبیر اسے مل رہی تھی۔

''اے کاش! یہ لمحات یہ دن ابدی ہو جائیں۔''

اس نے خلوص سے دعا مانگی۔

نور صفائی کر رہا تھا۔ لیکن کام کچھ اتنا کرنا نہیں جانتا تھا۔ کام کاج میں وہ خود بھی کوری تھی۔ کھانا پکانا اور کوئی بھی دوسرا کام اسے نہیں آتا تھا۔ لیکن یہاں سے جانے کے بعد کس محبت سے اس نے احسن کے لیے کارڈیگن بنایا۔ غلط سلط بناتی تو سمیعہ کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ لیکن وہ دھن کی پکی نکلی۔ نہ صرف ان کے لیے کارڈیگن بنایا بلکہ ان کے بیڈ کے لیے چادر اور تکیے بھی بنائے۔

''انہیں ان چیزوں کی کیا کمی ہے زرغونہ! بیکار میں ہلکان ہو رہی ہو۔''

''سمیعہ!'' وہ تڑپ اٹھتی۔

''میں قدم قدم پر اپنی یادیں بکھیر دینا چاہتی ہوں۔ احسن جس طرف بھی آنکھ اٹھا کر دیکھیں میرے خلوص اور پیار کا ایک جال سا پھیلا نظر آئے جس سے وہ اگر کبھی باہر نکلنا بھی چاہیں تو نہ نکل سکیں۔

باب نمبر:۲۴

''زرغونہ کہاں ہیں نور؟''

احسن نے کمرے میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں اور اسے نہ پا کر نوکر سے دریافت کیا۔

''وہ باورچی خانے میں ہیں۔'' نوکر مسکرا رہا تھا۔

''کیوں؟'' انہوں نے قدرے حیرانگی سے پوچھا۔

''رات کے لیے کھانا تیار کر رہی ہیں۔''

''تم منع کر دیتے نا۔'' احسن نے کسی قدر پریشانی سے کہا۔ وہ خائف تھے کہ کہیں ہاتھ وغیرہ نہ جلا بیٹھے۔ اس کی باتوں سے کسی حد تک وہ اندازہ لگا چکے تھے کہ وہ کام دام کرنا نہیں جانتی۔

''میں نے بہت منع کیا لیکن وہ بضد تھیں مجھے خاموش ہو جانا پڑا۔''

اور جب احسن کچن میں داخل ہوئے تو زرغونہ کا حلیہ دیکھ کر اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

وہ بیسن پھینٹ رہی تھی کلائیوں تک ہاتھ اس میں سنے ہوئے تھے۔اور اسی پر اکتفا نہ تھا بلکہ کانوں کے قریب بالوں اور بائیں رخسار کے نچلے حصے پر بھی بیسن اپنی بہار دکھا رہا تھا۔دو دو چولہوں پر پکتا کھانا اور آگ کی حدت تمتمایا اور گھبرایا ہوا چہرہ۔

احسن کو ہنستے دیکھ کر وہ جھینپ سی گئی۔

''بھلا تمہیں کس پاگل نے یہاں آنے کا مشورہ دیا تھا؟ ذرا اپنا حلیہ تو دیکھو۔''

''سب ٹھیک ہے۔'' وہ ناز سے مسکرائی۔

''زرغونہ ہاتھ واتھ جلا بیٹھو گی۔چھوڑو نور تیار کر لے گا۔''

''جل جاؤں گی تو مرہم لگانے کے لیے آپ جو ہیں۔'' اس نے محبت بھری نظروں سے احسن کو دیکھا۔

''لیکن جان بوجھ کر جلنا تو کوئی عقل مندی نہیں۔''

''دلکن کے بغیر جلا نہیں جاتا۔'' اس نے معنی خیز انداز میں انہیں دیکھا۔

''یہ درست ہے۔''

احسن اس کی آنکھوں میں جھانکے۔

''آپ کا کیا خیال ہے؟''

دبی دبی مسکراہٹ سے اس نے سوال ان کی طرف لوٹا دیا۔

''دلکن کے بغیر واقعی جلا نہیں جاتا۔''

ان کی خوبصورت آنکھوں میں مسکراہٹ تیر رہی تھی۔اور وہ گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''میری طبیعت گھبرا رہی ہے زرغونہ تم کس جھنجھٹ میں پڑ گئی ہو۔''

''نہیں احسن آج آپ میرے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھائیں گے۔''

''اچھی بات ہے میں تمہاری مدد کیے دیتا ہوں۔''

''نہیں نہیں آپ تھکے ہوئے ہیں۔آرام کیجیے۔''

''بہتر میں تمہاری مدد نہیں کروں گا لیکن چکھنے کا کام تو کر سکتا ہوں نا؟''

احسن نے قدرے شوخی سے کہا۔

قریب رکھی ہوئی پتیلی کا ڈھکن اٹھایا۔چاول پکے ہوئے تھے۔رنگ کچھ زیادہ ہی تیز تھا۔گلے ہوئے اتنے زیادہ تھے کہ کھچڑی معلوم ہو رہی تھی۔

''اجازت ہے؟'' ان کی آنکھوں میں شرارت وشوخی کا حسین امتزاج نظر آ رہا تھا۔

''مجھ سے کیا پوچھتے ہیں؟'' وہ تیکھے انداز میں مسکرائی۔

''بھئی تمہاری اجازت تو شرط اول ہے۔'' کہتے ہوئے انہوں نے تھوڑے سے چاول پلیٹ میں نکالے۔منہ میں ڈالے تو ان کے بھرپور قہقہے سے باورچی خانے کی ساری فضا گونج اٹھی۔

''کیا بات ہے؟ اچھے نہیں لگے؟'' وہ حد درجہ سراسیمہ نظر آ رہی تھی۔

''ذرا تم بھی دیکھو!'' احسن نے چمچ اس کی طرف بڑھایا۔اس نے منہ کھول دیا اور جوں ہی چاول اندر گئے خفت وشرمندگی سے اس کی پیشانی پر موتی سے چمک گئے۔چاولوں میں سرے سے نمک تھا ہی نہیں۔

''ہائے اللہ کتنی احمق ہوں۔اچھا اب ذرا سالن دیکھیے۔''

وہ بہت گھبرا گئی تھی۔

سالن دیکھا۔اس کا کوئی ذائقہ نہ تھا۔مرچیں بہت تیز تھیں لیکن احسن نے سنجیدگی سے سالن کی تعریف کی۔

''میری دلجوئی کے لیے تو نہیں کہہ رہے ہیں آپ؟'' اس نے بے چینی سے پھر پوچھا۔

''نہیں زرغونہ ایسی کوئی بات نہیں۔''

ان کے چہرے پر قوس قزح کے رنگ سے پھیل گئے۔ کچھ دیر وہاں ٹھہرے پھر اپنے کمرے میں آ گئے۔

ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ چہرے پر لطیف تاثرات کے دل کش رنگ پھیلے ہوئے تھے۔ زندگی آج کل ان کے لیے کسی ایسی حسین صبح کی مانند ہو گئی تھی جس نے ہر طرف روشن اجالے بکھیر دیئے ہوں۔ دراصل انہیں اپنی زندگی کا روکھا پن اور بے کیفی کبھی محسوس ہی نہ ہوئی تھی۔ دل کے خاموش سازوں سے کبھی کوئی نغمہ سنا ہی نہ تھا۔ حسین آنکھوں میں خوابوں نے کبھی انگڑائیاں لی ہی نہ تھیں، خود کو خدمت خلق میں اس حد تک ڈبو بیٹھے تھے کہ کبھی کچھ احساس ہی نہ ہوا تھا۔

اب دل کے خاموش تاروں نے جھنجھنا کر انگڑائی لی تھی اور روح کو مدہوش کر دینے والے نغمے ان تاروں سے پھوٹ نکلے تھے۔

زرغونہ ان کی زندگی کا سنہرا خواب تھی۔ اس کے والہانہ اور بے لوث پیار نے سب فاصلے مٹا ڈالے تھے۔ وہ اس کے بہت قریب آ چکے تھے۔

عنقریب ہی وہ اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے۔

''احسن! آیئے کھانا کھایئے۔''

انہوں نے محبت سے اُسے دیکھا اور اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

میز انواع و اقسام کی چیزوں سے پر تھی۔ زرغونہ کی وجہ سے خاموش رہے وگرنہ

کھانے کا اتنا ضیاع انہیں پسند نہ تھا۔ان کا نوکر کبھی دو سے زیادہ کھانے تیار نہ کرتا تھا۔

مسکراتے ہوئے انہوں نے کھانوں کو دیکھا اور پلیٹ میں چاول نکالنے لگے۔

چاول منہ میں ڈالے تو ایک بار پھر مسکرا اٹھے۔اب نمک تیز تھا۔سالن میں مرچیں زیادہ تھیں۔لیکن وہ مسکرا رہے تھے۔اور کھانے کی جی بھر کر تعریفیں کر رہے تھے۔

''آپ کو نمک زیادہ تو محسوس نہیں ہو رہا؟'' اس نے قدرے پریشانی سے انہیں دیکھا۔

اس کے معصوم چہرے پر گھبراہٹ سی تھی۔

''کچھ اتنا زیادہ بھی نہیں۔'' احسن مسکراہٹ دبا گئے۔

''اف مجھ سے تو چاول کھائے نہیں جا رہے۔'' احسن کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''روٹی کھاؤ۔''

چپاتی اٹھائی۔وہ کون سی اچھی پکی تھی۔

''آپ آج بھوکے رہیں گے؟''

''کیوں؟''

''کھانا کسی کام کا نہیں۔''

صاف گوئی سے وہ اپنے پھوہڑ پن کا اعتراف کر رہی تھی۔

''زرغونہ! تمہارا بے لوث خلوص ان سب سے بہت ارفع ہے۔یہ احساس کیا کم ہے کہ تم نے صرف میرے لیے اتنا کچھ کیا۔''

ان کا ٹھہرا ٹھہرا لہجہ بھرپور اپنائیت لیے ہوئے تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے چائے پی۔

''چلو زرغونہ باہر سیر کے لیے چلتے ہیں۔'' احسن نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

’’چلیے۔‘‘ اس کی آنکھوں میں خوشیوں کے کنول کھل گئے تھے۔

باب نمبر:۲۵

شام اور وہ بھی پہاڑ پر۔فضا کا سارا حسن خوبصورت آبشاروں ،شور مچاتے جھرنوں اور سبزے سے ڈھکی پہاڑیوں پر سمٹ آیا تھا۔سرمئی سوٹ میں ملبوس زرغونہ کا حسن اپنے عروج پر تھا۔گہرے چاکلیٹی شلوار قمیض میں احسن کی پر وقار شخصیت بھی کچھ اور نکھر آئی تھی سیاہ فیتے میں بندھا کیمرہ زرغونہ کے شانے سے لٹکا ہوا نیچے کمر تک جھول رہا تھا۔اس کے گداز ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی ۔آنکھوں میں جگمگاہٹ تھی ۔اور چہرہ دلی مسرت کا واضح عکاس تھا۔عمودی پہاڑی پر چڑھتے ہوئے اس نے گھوم کر اطراف میں دیکھا۔سبزہ ہی سبزہ کہیں اونچائی ،کہیں گہرائی اور گہرائی کے دامن میں بنے ہوئے ٹین کی چھتوں کے چھوٹے چھوٹے گھر۔

''احسن آپ یہاں بیٹھئے ۔میں آپ کی تصویر لوں گی ۔''

اس نے کیمرہ کندھے سے اتار کر ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا۔

''تم بیٹھو میں تمہاری لیتا ہوں۔''انہوں نے کیمرہ لینے کے لیے ہاتھ اس کی

طرف بڑھایا۔

''نہیں آپ۔'' وہ مچل اٹھی۔

یہ سوچتے ہوئے کہ اس کا کہنا مانے بغیر خلاصی نہیں ہوگی۔مناسب سی ایک جگہ دیکھ کر احسن کھڑے ہو گئے۔

''مسکرائیے نا!'' اس نے شوخی سے انہیں گھورا۔اور کیمرا آنکھ سے لگایا۔

ہلکی سی مسکراہٹ خود بخود ان کے ہونٹوں پر آ گئی۔

''ایک دم غضب کی تصویر'' اس کا ہاتھ فضا میں لہرایا۔ہونٹوں کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی بول رہی تھیں۔

''کیمرہ مجھے دو۔اب میں تمہاری لیتا ہوں۔''

ان کی آنکھ کیمرے پر تھی۔اور دل بٹن دبانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ایک خواہش سینے میں مچل رہی تھی کہ یوں ہی کھڑی رہے اور وہ اسے دیکھتے رہیں۔

کیسا صبیح چہرہ تھا۔سیاہ گھنے کٹے ہوئے بالوں میں چمکتا ہوا۔رومان پرور ماحول یہ سب کچھ کتنا حسین لگ رہا تھا۔

''جلدی کیجیے نا۔اتنی مشکل سے پوز بنایا ہے۔خراب ہو جائے گا۔''

''اچھا ہے ہونے دو۔'' احسن ہنس دیئے۔

''اللہ نہیں۔'' اس نے مچلتے ہوئے دونوں بازو جھٹکے۔

اور عین اسی وقت بٹن دبا دیا گیا۔

''یہ کیا کیا آپ نے؟اتنی خراب تصویر آئے گی۔''

''اچھا ہے نا'' انہوں نے کمال اطمینان سے کہا۔

''کیا اچھا ہے؟'' کسی ضدی بچے کی طرح اس نے گلا پھاڑا۔وہ لڑنے پر آمادہ

نظر آ رہی تھی۔

''خدا کے لیے چلاؤ تو نہیں۔'' احسن ابھی تک مسکرا رہے تھے۔

''آپ سمجھتے نہیں یہ تصویر میں آپ کو دینا چاہتی تھی۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''مجھے تمہاری تصویر کی کوئی ضرورت نہیں۔'' احسن قدرے سنجیدہ تھے۔

''کیا کہا آپ نے؟'' تڑپ کر وہ ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔اس کا جگمگاتا چہرہ بجھ سا گیا تھا اور آواز میں اداسی عود کر آئی۔

''غور سے سننا تھا۔'' معلوم ہوتا تھا وہ اس کی حالت سے بہت محظوظ ہو رہے تھے۔

''آپ کو میری تصویر کی کوئی ضرورت نہیں؟'' اس نے پریشانی کے عالم میں دوبارہ استفسار کیا۔

''ٹھیک سمجھی ہو۔'' کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے۔

وہ خاموش گنگ سی اسی جگہ کھڑی رہ گئی۔احسن نے دو تین بار پلٹ کر اسے دیکھا۔اور جب اس کی آنکھیں ڈبڈبانے کو ہوئیں تو وہ اس کے قریب چلے آئے۔

''زرغونہ ۔۔! مجھے تمہارے کاغذی پیکر کی ضرورت نہیں بلکہ تمہاری ضرورت ہے۔'' ان کی آواز میں دل کا سارا پیار سمٹا ہوا تھا۔

لیکن زرغونہ کے بھرے ہوئے پیمانوں کو ٹھیس لگ چکی تھی۔بازو پر سر کو جھکاتے ہوئے وہ سسک پڑی۔

احسن پریشان ہو گئے۔اسے شانوں سے پکڑا۔ایک ہاتھ سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا بند آنکھوں اور رخساروں پر پھیلی ہوئی آنسوؤں کی لکیریں دیکھ کر وہ تڑپ اٹھے۔

''میں نے تو محض تفنن طبع کے لیے ایسے کہا تھا۔تمہاری دل آزاری میرا مقصد نہ

تھا۔''

کافی دیر بعد اس کا موڈ سنبھلا۔

شام پھیکی پڑ رہی تھی۔ کیمرے کی فلم بھی ختم ہو گئی تھی۔ اور گھومتے گھومتے وہ بھی قدرے تھک سی گئی تھی۔ مناسب سی ایک جگہ احسن نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ خوشگوار موڈ میں تھی۔ دھیمی دھیمی آواز میں کچھ گنگنانے لگی۔

''قدرے اونچا تا کہ تمہارے پاس بیٹھا ہوا کوئی شخص بھی کچھ سن سکے۔'' احسن نے کہا۔

''آپ کچھ سنائیے۔''

''بدلہ چکانے میں خاصی ماہر ہو۔'' ان کی نگاہیں گہری تھیں۔

''سنائیے نا!'' اس نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اصرار کیا۔

''بھئی میں اس فن میں قطعی کورا ہوں۔ تم سناؤ۔''

''مجھے بھی کچھ اتنا زیادہ نہیں آتا۔''

''چلو جتنا آتا ہے اتنا ہی سہی۔''

مدھم مدھم آواز میں اس نے فیض کی نظم شروع کی۔

ہم پہ مشترک ہیں احسان غم الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے دکھ درد کے معنی سیکھے

زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رخ زرد کے معنی سیکھے
جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ پلکیں جن کے
اشک آنکھوں میں پلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

آواز میں کیسا درد تھا، کیسا سوز۔ احسن گم سم سے بیٹھے تھے۔ کافی دیر بعد انہوں نے کہا۔

''زرغونہ! تم نے اپنے بارے میں مجھے کچھ بتایا نہیں۔''

''کیا جاننا چاہتے ہیں آپ؟'' اس کا دل دھڑک اٹھا۔

''میں تمہیں تمہارے گھر والوں سے مانگنا چاہتا ہوں۔ اور یہ جاننے کا خواہشمند ہوں کہ اس سلسلے میں میری رسائی کس تک ہونی چاہیے۔''

وہ خاموش تھی۔ بالکل خاموش۔ رات تاریک تھی۔ آسمان پر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔

ایک بار تو جی چاہا حقیقت کے رخ پر اس نے جو دبیز پردے ڈالے ہوئے ہیں انہیں ایک ایک کر کے اٹھا دے اور احسن کو اپنے ماضی کی گھناؤنی تصویر دکھا دے۔

''نہیں نہیں۔'' اس کے دل نے آواز دی۔

''محبت نفرت میں بدل جائے گی۔ ایک غیور انسان کبھی یہ گوارا نہ کر سکے گا کہ اس

کا پیار کوٹھے کی پیداوار ہو۔ چاندی کے سکوں کے لیے سٹیج پر تھرکتا ہو۔''

اس کے سینے میں درد اپنی پوری شدت سے جاگ اٹھا تھا۔

آنکھیں بند کر کے اس راستے پر کس سرعت سے آگے بڑھ آئی تھی۔ کو محرومیوں کے سائے بھی ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ باایں ہمہ وہ مطمئن تھی۔ وہ انہیں پوجنا چاہتی تھی ناکامیوں کو خوشی سے گلے لگانا چاہتی تھی۔

یہ کیسی محبت کیسی چاہت تھی۔

یہ کیسی نرالی خواہش تھی۔

اس کے سوا اور راستہ بھی نہ تھا۔

اس کا دم گھٹنے لگا۔ پھوٹ پھوٹ کر جی رونے کو چاہنے لگا۔

''زرغونہ! تم خاموش ہو؟'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''احسن! آپ کو وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔ میرے حالات ابھی میری موافقت میں نہیں۔''

''مجھے کچھ بتاؤ گی نہیں۔''

''نہیں احسن نہیں۔'' اس کا دل بھر آیا تھا۔ اپنے ہی گھٹنوں پر سر رکھے وہ سسک اٹھی۔

''زرغونہ!'' وہ پریشان ہو اٹھے تھے۔

''میں ساری زندگی تمہارا انتظار کر سکتا ہوں۔ زرغونہ'' انہوں نے گہری محبت اور شفقت سے اس کے شانے تھپتھپائے۔ ان کا لہجہ بہت مدھم تھا۔

''آپ مجھ سے ایک وعدہ کیجیے۔'' زرغونہ نے آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھایا۔

''کیا؟''

اس کا جنون جاگ پڑا تھا۔کسی پاگل کی طرح احسن کا چہرہ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کے ہالے میں لے لیا۔رندھے ہوئے گلے سے وہ سسک رہی تھی۔

''احسن کائناتی نظام درہم برہم ہو جائے۔۔۔رات دن میں بدل جائے۔۔۔آفتاب طلوع ہونا چھوڑ دے۔کتنے ہی نامساعد حالات کیوں نہ ہوں کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔۔۔احسن آپ میری وفا پر کبھی شک نہیں کریں گے۔''

''زرغونہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

احسن کچھ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ کیا کریں۔

''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں۔''

انہوں نے ایک ہاتھ سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔دوسرے ہاتھ سے اس کا سر اپنے شانوں سے لگا لیا۔

باب نمبر:۲۶

چھوٹی بیگم صاحبہ سے کوئی داڑھی والے صاحب ملنے آئے ہیں۔'' خادمہ کھانے کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''کون ہیں؟'' ممتاز بائی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''مولوی صاحب ہیں۔سمیعہ کے چھوٹے بہن بھائیوں کو قرآن مجید پڑھاتے ہیں۔'' اس نے کمال اطمینان سے جواب دیا۔

''لیکن وہ یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟'' ممتاز بائی نے تلخی سے استفسار کیا۔

''میں نے بلوایا ہے۔قرآن پاک پڑھنا چاہتی ہوں۔''

ممتاز چپ سی ہوگئی تھی۔تھوڑی دیر بعد بولی۔مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔

''آپ سے کیا پوچھتی۔کیا ہم مسلمان نہیں؟ کیا یہ ہماری مقدس کتاب نہیں؟ کیا اسے پڑھنا ہمارا فرض نہیں؟''

اس نے کڑی نظروں سے ماں کو گھورا۔

''مجھے اس سے کوئی انکار نہیں ۔ہم مسلمان ہیں۔قرآن پاک پر ایمان رکھتے ہیں اور اسے پڑھتے بھی ہیں ۔پر مسئلہ تو تم جیسی لڑکی کا ہے جو پہلے ہی مجھ سے اکھڑی رہتی ہے۔''

''آپ کو قطعی فکر کی ضرورت نہیں ۔آپ نے جیسا چاہا ویسا کرلیا ۔کیا میں آپ کے کہنے کے مطابق کام نہیں کر رہی ہوں ۔کیسے؟ اسے کوئی مجھ سے پوچھے ۔اگر نواز علی جیسا مہربان شخص نہ ہوتا تو پھر دیکھتی ۔

مطمئن ہونا سیکھیں۔آخر اور کس چیز کی ضرورت ہے ۔''

''خود کو سمجھا لو کہ تم طوائف کی اولاد ہو۔بس یہ چاہتی ہوں ۔''

''طوائف ۔۔۔''

زرغونہ تلملا اٹھی چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ پیشانی تن گئی تھی۔نفرت سے بھرپور طنزیہ الفاظ کسی کھولتے لاوے کی طرح اسکے ہونٹوں سے ابل پڑے۔

''طوائف ممتاز بائی ہے زرغونہ نہیں ۔''

''اور تم کون ہو؟''

پرسکون انداز میں زرغونہ کو گھورتے ہوئے ممتاز بائی نے بارود پھینکا۔

''میں ۔۔۔ میں ۔۔زرغونہ ہوں۔''

اسے کوئی جواب سجھائی نہ دے رہا تھا۔

''تم زرغونہ ہو۔آسمان سے خدا نے تمہیں یوں ہی زمین پر پھینک دیا تھا شاید۔''

اس نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔

''تمہیں طوائف نے جنم دیا ہے۔تم بازار حسن کی پیداوار ہو گناہ کا ثمر ہو۔اپنی پیشانی کو دیکھو جہاں سیاہی چپکی ہوئی ہے ۔بھول جاؤ۔تم اسے کبھی دھو بھی سکو گی ۔حقیقت کی

دنیا میں رہو اور اپنی اصلیت پہچانو۔ کہتی ہے میں طوائف نہیں۔''

اس کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سانپ کی سی چمک تھی۔

''میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ مجھے کچھ سنانے کی ضرورت نہیں۔'' جنونی انداز میں وہ چیخی۔

''تمہیں سننا ہوگا۔ تم اپنی اوقات کو بھول رہی ہو۔ اور میں تمہیں یاد دلانا چاہتی ہوں۔''

ممتاز بائی پھنکاری۔

زرغونہ کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔ خون۔

اضطراری حالت میں اس کے دونوں ہاتھ میز کی طرف بڑھے اور آناً فاناً پلیٹیں دیواروں سے ٹکرانے لگیں۔ سالن کے ڈونگے شوربہ بہاتے ہوئے قالین پر لڑھکنے لگے، چھری، چمچ اور کانٹے ایک دوسرے کے ساتھ بجنے لگے۔

ایک پل میں جیسے قیامت آ گئی تھی۔ چھن چھن کی آوازوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔ ممتاز اور سرلا بائی دونوں اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔

''چھوٹی بیگم صاحبہ ہوش کیجیے۔''

خادمہ نے آگے بڑھ کر اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''چھوڑ دو مجھے۔'' اس نے خادمہ کو دھکا دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

چند لمحوں تک وہ گم سم سی رہیں۔ ایک منٹ میں ہی یہ سب کیا ہو گیا تھا۔

جب حواس قدرے بحال ہوئے تو سرلا بائی نے کہا۔

''ممتاز وقت کی نزاکت کو سمجھو۔ تمہیں تو جانے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اب کوئی بات تھی جس کا تم نے بتنگڑ بنایا۔

ارے سرلا تم کیوں نہیں سمجھتی ہو مجھے تو اس کا تنہا کئی کئی روز کے لیے باہر رہنا یہ ایسی باتیں نہیں جنہیں نظر انداز کیا جا سکے۔''

''کیا کرو گی تم؟ اس کا چلن تو ازلی بگڑا ہوا ہے۔ حالات تمہارے سامنے ہیں اسے توڑنے کی جتنی سعی کی گئی ہے اس میں اتنی ہی سختی اور رعونت آتی گئی ہے۔ بہتر ہے اس کے معاملات میں دخل اندازی یکسر ختم کر دی جائے۔''

''سرلا تمہیں میری بے بسی کا قطعاً خیال نہیں۔ میری طرف دیکھو مجھ جیسی عورت جس کے اشاروں پر ایک دنیا ناچتی تھی۔ آج اس کے ہاتھ پاؤں میں مجبوری کی بیڑیاں ہیں۔ مجھے اس کا سمیعہ اور اس کے خاندان سے ملنا پسند نہیں۔ اسے خراب کرنے میں ان لوگوں کا بہت ہاتھ ہے۔''

''لیکن سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمہاری پسندیدگی کی وقعت ہی کیا ہے؟''

سرلا بائی نے حقیقت بیانی سے کام لیا۔

''میں نے حماقت کی۔ میں نے بے وقوفی کا ثبوت دیا۔ حرام زادی وہیں رہتی تو اکڑی گردن خود بخود ٹوٹ جاتی۔'' وہ غصے سے تلملاتی ہوئی بولی۔

''خیال خام ہے تمہارا۔ وہ یا تو خود موت کو گلے لگا لیتی یا کسی کوٹھا کانے لگا دیتی۔ دونوں صورتیں ہی تباہ کن تھیں۔ چھوڑ اسے اس کے حال پر۔ ورنہ سونے کی چڑیا ہاتھوں سے اڑ جائے گی۔''

''واہ تم نے کیا سمجھا ہے ممتاز بائی اب اتنی بھی گئی گزری نہیں پر کاٹ کر پنجرے میں نہ بند کر دوں۔ گلا نہ گھونٹ دوں اس پار نہ پہنچا دوں۔ سرلا تم نے مجھے کیا سمجھا؟'' ممتاز بائی پر ایک جلال آیا ہوا تھا۔

''مجھے اعتراف ہے۔ میں جانتی ہوں اگر تم چاہو تو آسمان سے تارے بھی توڑ سکتی

ہو۔لیکن وہ تمہاری اولاد ہے۔تم اگر شکست تسلیم نہیں کرتیں تو وہ کیسے مان جائے؟تم اگر پتھر ہوتو وہ لوہا ہے۔بات کیسے بنے؟''

سرلابائی نے بتحمل و بردباری سے اپنے موقف کی وضاحت کی۔

''مجھے تو کچھ یوں لگتا ہے جیسے اس حرافہ کے گھر میں کوئی چکر چلا رہی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

سرلابائی نے حیرت سے دیکھا۔

''مطلب یہی کہ اس کے کسی رشتہ دار سے نظر بازی ہے۔''

''نہیں نہیں ممتاز مجھے اس پر قطعی یقین نہیں۔'' اس نے فوراً تردید کی۔

''یہ بھی دیکھ لینا۔تمہیں میری باتوں پر ذرا کم ہی یقین آتا ہے۔اور جب وہی چیز کھل کر سامنے آجاتی ہے تب تمہیں احساس ہوتا ہے۔'' اس نے طنز سے اسے دیکھا۔

''تمہاری فراست کی میں شروع ہی سے قائل رہی ہوں یہ بات نہیں۔یوں ہی دل نہیں مانتا۔''

''ایک دن وہ بھی مانے گا۔ذرا بات کھلنے دو۔''

''ممتاز اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو یہ بہت خطرناک ہوگا۔اس کا مطلب ہے ہمارا مستقبل ہنوز تاریکی میں ہے۔'' سرلابائی نے خدشے کا اظہار کیا۔

''اس پر تو اسی دن گہن لگ گیا تھا جس منحوس دن وہ پیدا ہوئی تھی۔اگر اس گھڑی یہ پتہ ہوتا کہ میں نے سنپولیے کو جنم دیا ہے تو اسی وقت گلا نہ گھونٹ دیتی۔سب بک بک جھک جھک ختم ہوجاتی۔یہ روز روز کا کڑھنا اور جلنا تو نہ ہوتا۔''

اور فون کی گھنٹی نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ممتاز بائی ریسور اٹھا کر کسی سے باتیں کرنے میں مگن ہوگئی۔

باب نمبر: ۲۷

سر کو موٹے دوپٹے سے ڈھانپے نگاہوں میں عقیدت واحترام کی دنیا سمیٹے جب وہ قرآن پاک کو ریشمی جزدان سے نکالتی ۔اسے بوسہ دے کر پڑھنے کے لیے کھولتی تو وہ چھدری داڑھی والے حافظ قرآن محبت سے اسے دیکھتے اور بے اختیار سوچنے لگتے کہ یہ پاکیزہ روح بھٹک کر کہاں اور کس جگہ آ گئی ہے جو کسی طور بھی اس کے قابل نہیں ۔

نماز وہ سیکھ چکی تھی اور آج کل باقاعدگی سے پڑھ رہی تھی ۔کتنا سکون ملتا تھا اسے اس رب جلیل کے حضور جھک کر۔ وہ ایک انوکھی لذت سے آشنا ہو گئی تھی۔

اس ملگجی شام جب وہ سٹوڈیو سے کسی فلم کی شوٹنگ سے فارغ ہو کر آئی تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی ۔ریسیور اٹھایا۔فون پر سمیعہ تھی۔

''زرغونہ! احسن آئے ہیں فوراً پہنچو۔تفصیل آنے پر بتاؤں گی۔''

''احسن!'' اس کا سانس معلق ہو گیا تھا۔

''احسن؟''

''سمیعہ اف احسن کیسے آ گئے ہیں؟ انہیں گھر کا کیسے پتہ چلا؟''

گھبراہٹ سے اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ دیوانہ وار وہ گیراج کی طرف بڑھی۔ گاڑی نکالی اور خوفناک حد تک تیز ڈرائیو کرنے لگی۔ وزیر ولا کے گیٹ میں جب کار داخل ہوئی۔ سمیعہ پورچ کے قریب کھڑی تھی۔

بجلی کی سی تیزی سے وہ باہر نکلی۔

''سمیعہ تم نے احسن کو کیسے پہچان لیا؟ وہ کیسے آئے ہیں؟ انہیں میرے متعلق کچھ علم تو نہیں ہوا؟''

اس کا تنفس بہت تیز تھا۔ آنکھوں میں خوف و ہراس سمٹا ہوا تھا اور ہونٹوں پر خشک پپڑیاں سی جم رہی تھیں۔

''اپنے آپ پر قابو پاؤ زرغونہ! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ خدا کا شکر ہے وہ سب سے پہلے مجھے ہی ملے۔ ان کے پوچھنے پر کہ کیا مس زرغونہ یہاں رہتی ہیں؟ مجھے یہ سمجھنے میں قطعی دقت نہ ہوئی کہ وہ کون ہیں؟''

''لیکن سمیعہ انہیں گھر کا کیسے علم ہوا؟''

''میرا خیال ہے بنگلے سے معلوم کیا ہوگا۔''

''تم سے میرے بارے میں پوچھا تو تم نے کیا جواب دیا؟''

''پاگل ہو رہی ہو بھئی۔ میں نے وہی کہا جو مجھے کہنا چاہئے تھا۔''

''کیا؟ میں بھی تو سنوں۔'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔

''اللہ کیا ہو رہا ہے تمہیں زرغونہ!'' سمیعہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔

''تم میری حالت کو سمجھتی کیوں نہیں؟'' زرغونہ نے تلخی سے کہا۔

''خوب سمجھتی ہوں۔ عشق نے دماغ خراب کر ڈالا ہے اور کیا؟''

''سمیعہ!'' وہ چیخی۔

''میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''اف توبہ! بھئی میں نے کہا کہ ہاں یہ مس زرغونہ کی رہائش گاہ ہے آپ تشریف رکھیے وہ کسی کام سے باہر گئی ہیں۔آتی ہی ہوں گی۔''

''ان دنوں شہر میں میری فلم چل رہی ہے۔اگر احسن نے کہیں دیکھ لیا تو۔۔۔'' وہ بہت پریشان تھی۔

''فضول فکر میں گھلی جا رہی ہو۔جاؤ جا کر باتھ روم میں اپنا حلیہ ٹھیک کرو میں چائے لے کر آتی ہوں۔''

چہرے پر بشاشت لاتے ہوئے اس نے پردہ اٹھایا۔کتھئی سوٹ میں احسن کی شخصیت دل آویز نظر آ رہی تھی۔میٹھی سی مسکراہٹ ہونٹوں کا جز بنی ہوئی تھی۔زرغونہ کو دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں خوشی کے چراغ جل اٹھے۔مسکراتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

جواباً وہ بھی مسکرائی۔لیکن یہ وہ مسکراہٹ تھی جسے اس نے جبراً اپنے ہونٹوں پر گھسیٹا تھا۔

''آپ۔۔۔آپ شہر کیسے آئے؟'' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''تم سے ملنے۔'' احسن خوش دلی سے مسکرائے۔

''آپ کو گھر کا کیسے پتہ چلا؟''

''تمہارے گھر کا پتہ چلانا کچھ اتنا مشکل تو نہیں زرغونہ!''

''آپ نے اپنے آنے کی وجہ نہیں بتائی۔'' زرغونہ نے دوبارہ پوچھا۔

''تمہیں یقین نہیں؟'' احسن نے اس کی طرف بغور دیکھا۔

''آپ کہیں اور مجھے یقین نہ آئے ناممکن ہے۔''

کہنے کو تو اس نے یہ الفاظ کہہ دیئے ۔لیکن ان کی ادائیگی کرتے وقت اس کے چہرے پر دلی تاثرات کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ان میں پیار کی گرمی اور چاشنی نہ تھی ۔

احسن بھی حیران سے تھے۔اس کا رویہ کچھ الجھا الجھا سا نظر آرہا تھا۔وہ معصوم اور جگمگاتی آنکھوں والی زرغونہ جو ہر بات پر پیاری سی ہنسی ہنستی غائب تھی اور سہمی سہمی گھبرائی گھبرائی اڑے اڑے چہرے والی زرغونہ سامنے بیٹھی تھی ۔

''دراصل نعیم بیمار تھا اور دوسرے میرے ڈاکٹر یہاں چند اور کلینک کھولنا چاہتے تھے کافی عرصے سے بلا رہے تھے۔'' احسن نے ٹھہری ٹھہری آواز میں اسے بتایا۔

''کتنے دن ہوئے ہیں آپ کو یہاں آئے ہوئے؟''

ہفتہ بھر ہو رہا ہے۔دراصل اس کی حالت کچھ زیادہ خراب تھی۔بالکل وقت ہی نہیں مل سکا۔کل سے وہ قدرے بہتر ہے آنا تو میں کل ہی چاہتا تھا لیکن کل کا سارا دن ڈاکٹروں سے مشورہ کرنے میں گزر گیا۔''

سمیعہ چائے لے کر کمرے میں آئی ۔

''اگر میں غلطی پر نہیں تو یہ غالباً تمہاری کزن ہیں جن کا ذکر تم نے مجھ سے کیا تھا۔''

''جی ہاں!'' وہ سمیعہ کی طرف دیکھتے ہوئے اداسی سے مسکرائی۔

سمیعہ نے چائے بنائی۔تینوں چائے پینے لگے سمیعہ احسن سے کلینک کے متعلق پوچھنے لگی اور وہ خاموش بیٹھی چائے کے گھونٹ حلق سے اتارتی رہی ۔

فضا کچھ بوجھل سی ہو رہی تھی۔سمیعہ حتی الامکان ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔لیکن زرغونہ کے دل پر خوف و ہراس کی ایسی گھنی پرچھائیاں رقصاں تھیں کہ مسکرانے کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی ۔

''اچھا اب مجھے اجازت دیجیے۔'' انہوں نے کپ تپائی پر رکھتے ہوئے اٹھنے کی

کوشش کی۔

''اتنی جلدی؟'' رات کا کھانا کھا کر جایئے۔'' سمیعہ نے رسمی سا اصرار کیا۔

لیکن زرغونہ بالکل خاموش تھی۔

سمیعہ کسی کام کے بہانے کمرے سے نکل گئی۔

دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔احسن اب جلد سے جلد جانا چاہتے تھے۔

''آپ واپس کب جا رہے ہیں؟''زرغونہ نے انہیں مغموم نظروں سے دیکھا۔

''انشا اللہ صبح اگر نعیم کی طبیعت ٹھیک رہی۔''وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''زرغونہ! میں تمہیں پریشان اور گھبرایا ہوا سا دیکھ رہا ہوں۔کیا تمہیں میرے آنے سے تکلیف ہوئی ہے؟''

''نہیں احسن۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھ سے چھپانے کی ضرورت نہیں زرغونہ!''

ان کی آنکھوں سے محبت اور خلوص کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔اور اس روشنی میں نہاتی ہوئی زرغونہ سوچ رہی تھی کہ یہ روشنی اسے کبھی نہیں مل سکتی۔وہ ازلی بدنصیب ہے۔

''میں منتظر ہوں۔'' وہ اس کے بالکل قریب کھڑے تھے۔اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔

''زرغونہ!''

بے اختیار ان کے ہاتھ اس کے شانوں پر آ گئے۔

''مجبور کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔مگر کوئی پریشانی والی بات ہے۔

تو بتاؤ۔''

نہیں احسن ایسی کچھ بات نہیں۔

''پراٹ کب آؤ گی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جب وقت ملا۔'' اس نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

''خدا حافظ!''

اس کا نرم و نازک ہاتھ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑا۔ محبت سے اسے دبایا اور اسے کمرے میں ہی چھوڑ کر باہر نکل آئے۔

آنسوؤں کا ایک طوفان تھا جو زرغونہ کی آنکھوں سے بہہ نکلا۔

''خدا کرے وہ صبح یہاں سے چلے جائیں اگر ان کی نظر کسی پوسٹر پر پڑ گئی تو۔۔''

کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ خود سے مخاطب ہوئی۔

''خدایا! اتنی جلدی نہیں۔۔ان کی رفاقت سے ان کی محبت سے مجھے اتنی جلدی محروم نہ کر دینا۔لیکن کب تک تم دھوکا اور فریب کا یہ کھیل کھیلتی رہو گی یہ جرم ہے، یہ گناہ ہے۔۔یہ گناہ ہے۔''

وہ بے دم ہو کر صوفے پر گر گئی۔

باب نمبر: ۲۸

فراخ سانولی پیشانی ہلکی ہلکی شکنیں لیے ہوئے تھی۔ سیاہ پتلیوں والی روشن آنکھوں میں گہری سوچ اور سنجیدہ چہرے پر قدرے تفکر چھایا ہوا تھا۔ بجھی بجھی آنکھیں سہما سہما گھبرایا چہرہ ونڈ سکرین پر رقصاں تھا۔

دماغ الجھ رہا تھا۔ سٹیرنگ وہیل پر مضبوطی سے ہاتھ جماتے ہوئے انہوں نے سر جھٹکا۔ آنکھوں میں پھوٹتی مسرت کی کرنیں چہرے پر دوڑتے شہابی رنگ ذہن کی سطح پر نمودار ہوئے۔

چند بار سر جھٹکا لیکن رنگوں کی جاذبیت میں اتنی ہی دل فریبی آتی گئی۔ اور یہ دل فریبی اپنی انتہا پر پہنچ کر زرد رنگ میں بدل گئی۔ یہ بیمار سا انداز تپاک کتنا عجیب سا تھا؟ کتنی مجبوری تھی؟ کتنا یاس جھلکتا تھا؟

''زرغونہ! اتنا قریب آجانے کے بعد بھی تم خود کو مجھ پر ظاہر کرنے سے گریزاں کیوں ہو؟ تمہیں شاید مجھ پر اعتماد نہیں۔ بہر حال میں تمہارے گھر والوں سے ضرور ملوں گا۔''

انہوں نے خود سے کہا۔

کار شفاف سڑک کے سینے پر تیزی سے پھسلتی جا رہی تھی۔ کہ یک دم رک گئی۔ دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ سڑک کے دوسری طرف آسمانی رنگ کی ایک مرسیڈیز رک چکی تھی اور چھبیس ستائیس سال کا ایک نوجوان اس میں سے نکل کر مسکراتے ہوئے احسن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قریب آنے پر خوشگوار مسکراہٹوں کے ساتھ وہ ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

''عید کا یہ چاند آسمانی دنیا سے زمین پر کب اترا ہے؟''

فاروق ان کے پہاڑ پر رہنے کو آسمانی دنیا سے تشبیہ دیا کرتا تھا۔

''جب تم نے دیکھا۔'' احسن مسکرائے۔

''کوئی تمہاری طرح یوں مریضوں کے پیچھے تیاگ نہیں لیتا۔''

فاروق کی آواز میں ایک گلہ تھی۔ دبی دبی شکایت تھی۔

''انسان فطرت سے مجبور ہیں فاروق! اچھا چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ منزہ کیسی ہے؟ اور شادی کب کر رہے ہو؟''

احسن اس کی دادی کمبخت کو گولی مارنے کو جی چاہتا ہے۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے لیکن جینا حرام کر رکھا ہے۔

کیوں خیریت؟

کیا کروں دال پ نہیں گلنے دیتی۔

کسی اور جگہ ارادہ ہے ان کا؟ احسن نے پوچھا۔

اپنے نواسے سے چاہتی ہے۔ گھر والوں کی کیا رائے ہے؟

وہ کسی حد تک میری حمایت میں ہیں۔ لیکن اس بڑھیا کا بھی بہت احترام کرتے ہیں۔

منزہ کیا کہتی ہے؟

انتظار۔۔۔میں تو اس انتظار کے چکر میں بوڑھا ہو جاؤں گا۔فاروق نے حسرت سے کہا۔

بس اتنا ہی دعوی ہے پیار کا۔احسن نے ہنستے ہوئے طنز کیا۔

تم نے اپنے بارے میں نہیں بتایا، یہاں کب اور کیسے آئے؟

نعیم بیمار تھا ہسپتال کھولنے کا ارادہ ہے ایک ہفتہ ہو رہا ہے مجھے یہاں آئے ہوئے۔

نعیم کو کیا ہوا؟اس نے حیرانی سے دریافت کیا۔

احسن نے اس کے متعلق تفصیل سے بتایا تو فاروق کو بہت افسوس ہوا کہ ایک شہر میں ہوتے ہوئے بھی وہ اس کے متعلق نہ جان سکا۔

تم اسی کے پاس ٹھہرے ہونا؟میں رات کو اسے دیکھنے آؤں گا۔

فاروق نے الوداعی مصافحہ کیا۔اور رخصت ہو گیا۔وہ تو اپنی کار میں بیٹھ کر چلا گیا لیکن احسن کو فقیروں نے گھیر لیا۔انہیں کچھ دے دلا کر فارغ ہوئے تو کار کی جانب بڑھے۔

پٹ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو نگاہ یوں ہی اوپر اٹھ گئی۔ہاتھ جو بڑھا تھا وہیں رک گیا۔قدم جس انداز میں اٹھے تھے،اسی انداز میں زمین پر ثبت ہو گئے۔

آنکھوں میں تحیر کی ایک دنیا لئے وہ برقی کھمبے کے ساتھ لٹکے ایک پوسٹر کو دیکھ رہے تھے جس پر ہلکے پیلے سبز اور سرخ رنگوں کے امتزاج سے ایک لڑکی کی جو شبیہ بنائی گئی تھی اس پر سو فیصدی زرغونہ کا گمان ہو رہا تھا۔

وہی آنکھیں وہی ہونٹ۔۔۔ان کا دماغ چکرانے لگا۔پلکیں جھپک جھپک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہوں نے اس تصویر کو گھورا۔سر مو کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔

یہ سب کیا ہے؟

وہ پریشان ہو اٹھے تھے۔قریب گئے نام پڑھا۔

سینہ لکھا نظر آیا۔

کیا ایک انسان دوسرے انسان سے اس حد تک مشابہت رکھ سکتا ہے؟۔۔۔انہوں نے خود سے سوال کیا۔

نہیں اس حد تک مشابہت ناممکن ہے۔دماغ نے جواب دیا۔

لیکن ایک اچھے معزز گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکی کا ان پوسٹروں پر کیا کام؟ یہ بھی تو سوچونا۔دل کب غافل تھا؟

اس کے معزز گھرانے سے تعلق رکھنے کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟ دماغ نے جرح کی۔

دل و دماغ کی ان پے در پے ضربوں سے وہ پاگل ہو اٹھے۔بے چارگی بے بسی آنکھوں میں رقصاں تھی۔پوسٹر پر نگاہیں جمی تھیں۔عینہ زرغونہ نظر آرہی تھی۔

وہ کچھ دیر تک پوسٹر کو گھورتے رہے۔شاید اور دیکھتے رہتے کہ چند سائیکل سوار چھوکرے انہیں یوں دیوانوں کی طرح پوسٹر کو گھورتے دیکھ قریب آکر بھونڈے مذاق کرنے لگے۔

سالی قیامت ہے۔ہوش و حواس ہی اڑا دیتی ہے۔

یوں معلوم ہوا جیسے کسی نے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا ہو۔

تڑپ کر پلٹے،کار میں بیٹھے اور کار چلا دی۔ایک بڑے مقامی سینما کے سامنے جا رُکے،ٹکٹ خریدا اور اندر داخل ہو گئے۔

ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔پکچر شروع ہو چکی تھی۔

سکرین پر آندھی اور سیاہ بادلوں کی یلغار تھی۔آسمانی بجلی بادلوں کا سینہ چیرتے ہوئے تڑپ رہی تھی اور برق و باراں کے اس طوفان میں ایک نوخیز لڑکی تیزی سے بھاگتے ہوئے پناہ ڈھونڈھ رہی تھی۔

لڑکی کے چہرے کا رخ بدلا تو احسن کو سکرین کی آسمانی بجلی کسی کوندے کی مانند اپنی طرف لپکتی دکھائی دی۔

اضطرابی عالم میں انہوں نے کرسی کے بازو کو مظبوطی سے پکڑ لیا۔آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔چند لمحوں بعد تپتی آنکھیں پھر کھولیں۔گرم گرم ریت کے ذرے سے آنکھوں میں گھستے چلے گئے۔

وہ زرغونہ نہیں تو اور کون تھی؟اب تو شک و شبہ کو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ایک خوش شکل لڑکے سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے میں محو تھی۔

سینما ہال کی دیواریں سرخ سرخ آگ کے انگاروں میں بدل گئی تھی۔ہر طرف آگ ہی آگ نظر آ رہی تھی۔دم گھٹ رہا تھا۔یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جل رہے ہوں۔پھنک رہے ہوں۔

لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکلے۔کار میں بیٹھے اور جانے کیسے نعیم کے گھر پہنچ گئے؟نوکر نے انہیں اس بری حالت میں کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا یاسمین کو اطلاع دی۔وہ بھاگی بھاگی کمرے میں آئی۔انہیں اس حالت میں دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔شوہر کی بیماری نے پہلے ہی نڈھال کر رکھا تھا۔

ڈاکٹر کو فون کیا۔ڈاکٹر آیا انہیں دیکھا اور بتایا کہ کسی ناگہانی صدمے نے دماغ پر گہرا اثر ڈالا ہے کوشش کیجیے کہ رو سکیں۔

کیسا صدمہ؟وہ گھبرا اٹھی۔اچھے بھلے تو کسی سے ملنے گئے تھے۔اب تو نعیم بھی

خطرے سے باہر ہیں کہ میں یہی سمجھوں کہ ان کی بیماری نے اثر کیا ہے۔

وہ اس عظیم انسان سے حد درجہ متاثر تھی۔ہاتھ پاؤں پھولے پڑ رہے تھے۔شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔آٹھ بجے فاروق نعیم کو دیکھنے آیا۔تو یاسمین نے اسے بتایا۔

لیکن بھابھی وہ تو مجھ سے شام میں ملا ہے۔کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔نعیم کے متعلق بھی تو اس نے مجھے بتایا تھا۔

فاروق جب یاسمین کے ساتھ ان کے کمرے میں آئے تو وہ چھت کو گھور رہے تھے۔چہرے پر اتنی زردی تھی کہ مہینوں کے بیمار دکھائی دے رہے تھے۔

احسن بھیا! کچھ تو بتایئے آپ کو کیا ہوا ہے؟ان کی آواز میں نقاہت تھی۔

یہ کیا؟

فاروق کی آنکھوں میں حیرت واستعجاب کا ایک سمندر امڈا ہوا تھا۔حیرانی کی تو بات ہی تھی۔اچھے بھلے تو شام کو ملے تھے چند گھنٹوں میں ہی عظیم تغیر۔

احسن کچھ تو بتاؤ!

فاروق نے محبت سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر دبایا۔

لیکن وہ کچھ جواب نہ دے سکے۔

گیارہ بجے تک فاروق ان کے پاس ٹھہرا۔انہوں نے خود ہی اصرار کر کے اسے گھر بھیج دیا۔

وہ کمرے میں تنہا تھے۔

پیار کے وہ پھول جن کے رنگ میں ان کا دلی خلوص اور جن کی مہک میں ان کی روح کا پیار شامل تھا،ان میں آگ لگ گئی تھی۔وہ انگارے بن چکے تھے اور دامن کو جلا کر خاکستر بنا رہے تھے۔

دو دن بعد وہ گھر جا رہے تھے۔ سوچ رہے تھے۔

کبھی طوفان یوں بھی آتے ہیں۔ یوں کہ آرزوؤں اور تمناؤں کا کوئی نشان ہی نہ ملے اور ہر چیز پلک جھپکتے میں لٹ جائے۔

لیکن وہ اپنے آپ کو کوئی جواب نہ دے سکے۔

باب نمبر:۲۹

سنگِ مرمر کی بنچ پر سر رکھے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں ۔رات کی بھیگی بھیگی خنک ہوائیں معطر خوشبو کے گیت گاتی پھر رہی تھیں ۔

شبنم کے موتیوں سے لبریز آنکھیں اٹھا کر اس نے اس سحر زدہ ماحول کو دیکھا اور آنکھیں بند کر کے پھر سسک پڑی۔

تم مجھ سے ملنے آئے تھے؟ مجھ سے؟اس کی آواز ہچکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی ۔

لیکن تمہیں دیکھ کر میرے لبوں نے مسکراہٹ نہ بکھیری۔میری آنکھوں میں خوشی کے دیپ نہ جلے۔تم کیا سوچتے ہو گے تمہاری پذیرائی میں نے کیسے کی؟احسن!تمہاری زرغونہ مجبور تھی ۔وہ تو ان راہوں پر سجدے کرتی جن پر چل کر تم اس سے ملنے آئے تھے۔ان جگہوں کو چومتی جن پر تم بیٹھے تھے ۔

اے کاش!میں سمیعہ ہوتی ۔اے کاش وہ گھر میرا اپنا گھر ہوتا۔۔۔

اس کا دل ڈوب رہا تھا۔موٹے موٹے آنسوؤں کی لڑیاں تیزی سے رخساروں پر

لڑھک رہی تھیں۔

پاگلوں کی طرح اس نے سر اوپر اٹھایا۔چاند کو دیکھا اور مجنونانہ انداز میں چیخی۔

اے حسین کرنو۔اے خوشبو اڑاتی خنک ہواؤ!میرے احسن کو میری مجبوریاں بتا دینا۔شدت گریہ سے اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔

رات گزرتی جا رہی تھی۔ممتاز بائی اُسے تلاش کرتی ہوئی لان میں آئی۔قریب آ کر اُسے پکارا۔

لیکن اس نے پکار کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''زرغونہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیا سٹوڈیو میں کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے۔اٹھو بیٹی !''

اس نے آہستگی سے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔لیکن زرغونہ نے بازو کو بیزاری سے جھٹکا دیتے ہوئے اپنا بازو چھڑا لیا۔

میری بیٹی ! حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھو''ممتاز بائی نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

بیٹی کی فطرت کو اچھی طرح جانتی تھی۔قوی یقین تھا کہ سٹوڈیو میں کسی سے جھگڑ پڑی ہے۔

''اٹھو کمرے میں چلو''اس نے جھنجوڑا۔

''چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو، یہاں سے چلی جاؤ۔میرے رستے ہوئے زخموں کو اور زیادہ چھیلنے کی کوشش نہ کرو۔ورنہ پھٹ جائیں گے۔''

وہ چیخ اٹھی۔

''پاگل ہو گئی ہو۔''ممتاز بائی کے لہجے میں تندی تھی۔

''تم جاؤ یہاں سے۔میں نے کہا ہے چلی جاؤ۔تمہاری صورت نہیں دیکھنا

چاہتی۔''وہ بپھر اٹھی۔

''دیکھو بیٹی ٹھنڈک بڑھ گئی ہے۔سردی لگ جائے گی۔''اس کی حالت دیکھتے ہوئے ممتاز بائی نے پینترا بدلا۔

''مجھے تمہاری ہمدردیوں کی ضرورت نہیں۔جاؤ مجھے تنہا چھوڑ دو۔جاؤ۔''

''خدا کرے زرغونہ تمہیں موت آجائے۔تم تو میرے لیے جیتا جاگتا، چلتا پھرتا عذاب بن گئی ہو۔''

''میں اتنی خوش نصیب کہاں کہ مجھے موت آئے۔''اس کے لہجے میں زہر ہی زہر تھا۔

اندر جاکر ممتاز بائی نے سرلا بائی کو بھیجا۔وہ آئی اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔آہستگی سے اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے بالوں میں محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''مجھے بتاؤ تو سہی تجھے کیا دکھ ہے زرغونہ ؟''

''جب میرے دکھوں کو تم سمجھ نہیں سکتی ہو۔جب میرے زخموں کا علاج تم کر نہیں سکتی ہو،تو پوچھنے سے فائدہ؟میرے رونے اور کراہنے پر پابندیاں کیوں؟۔۔۔اس کی آواز میں خنجر کی سی کاٹ تھی۔

''کچھ کہو تو سہی ممکن ہے میں تمہارے لئے کچھ کر سکوں۔''

''تم لوگوں نے میرے لئے کیا کرنا ہے؟جب کہ خدا نے کچھ نہیں کیا۔''

''یوں نہیں کہتے بیٹا !''

''اور کیا کہوں؟یہ کلنک کا ٹیکہ لگانے کے لیے کیا خدا کو میری پیشانی ہی نظر آئی تھی۔تم سرلا بائی یہاں سے چلی جاؤ۔''

اس کا جنون پھر جاگ پڑا تھا۔

''فضا میں خنکی ہے۔ٹھنڈ لگ جائے گی۔چلو اٹھو کمرے میں چلو۔''

''لگنے دو ٹھنڈ۔تم جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔''اس نے بیزاری سے کہا۔

تھوڑی دیر اور اصرار کرنے کے بعد سرلا بائی بھی چلی گئی۔اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا دل کوئی مٹھی میں لے کر مسل رہا ہو۔نا قابلِ برداشت ٹیس اٹھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

طویل شب اس نے باغیچے میں گھومتے بیٹھتے، روتے اور آہ و زاری میں گزار دی۔ صبح کے قریب اپنے کمرے میں گئی۔ٹوٹتے جسم اور زخمی دل کے ساتھ۔بستر پر لیٹ گئی۔رات بھر کی بے خوابی اور تھکن نے اس پر غنودگی سی طاری کر دی۔اور وہ سو گئی۔

باب نمبر: ۳۰

حد درجہ تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ تھکی تھکی چال سے وہ باورچی خانے میں گل باز خان کو کافی تیار کرنے کے لیے کہنے آئے۔ دائیں طرف دیکھا۔ مرمریں پیشانی پر چمکتے موتی۔ آنکھوں میں جلتے خوشی کے دیپ، لبوں پر شہد آگئیں مسکراہٹ اور تیز متحرک ہاتھ۔ وہ ٹھٹھک سے گئے۔

یکسر بھول گئے کہ یہاں کس لئے آئے تھے۔ گل باز باورچی خانے میں نہیں تھا۔ دروازے کا پٹ پکڑے وہ کسی بت کی طرح کھڑے تھے۔

''میں یہ سب کچھ بھول کیوں نہیں جاتا؟ یادوں کے یہ نقوش ذہن سے مٹ کیوں نہیں جاتے؟ میرا دل یہ کیوں نہیں سمجھتا کہ زرغونہ ایک سراب تھی۔ صحرا میں چمکتی ہوئی پاؤں جھلسانے والی ریت جس پر ایک پیاسے مسافر کو ہر آن ہر لمحہ کسی ٹھنڈے میٹھے پانی سے لبالب بھرے دریا کا گمان گزرے۔''

لیکن زرغونہ کو بھول جانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔

ان کے شانوں پر اس کی زلفیں پریشان رہی تھیں۔ان کے سینے پر اس کے آنسوؤں کے داغ تھے۔ان کے ہاتھوں میں اس کے ہاتھوں کے لمس کی گرمی تھی۔ان کی کانوں میں اُس کے میٹھے بول محفوظ تھے۔جدھر دیکھتے ہر طرف اس کا چلتا پھرتا پیکر نظر آتا۔نقرئی قہقہے تصور میں گونجتے اور تڑپا جاتے۔جنونی انداز میں وہ اپنے کندھوں پر ہاتھ پھیرتے۔سینے کو مسلتے،ہاتھوں کو توڑنے کی کوشش کرتے۔

لیکن یہ سب فضول تھا۔یہ نقش سطحی نہ تھے جنہیں ناخنوں کی ہلکی سی کھرچ سے نوچ ڈالتے۔وہ تو اتنے گہرے ہو چکے تھے کہ مٹانے کی کوشش کی تو وہ خود ہی زخمی ہو گئے۔

وہ بیڈ کور جسے اس نے اتنی چاہت سے بنایا تھا۔وہ سویٹر جس کے ایک ایک خانے میں اس نے اپنی محبت کو بنا تھا،سب احسن کے جنون کی نذر ہو چکے تھے۔خود کو مصروف رکھنے کی ہر کوشش بے کار ہو رہی تھی۔ان کی حالت کسی اعصابی مریض کی سی تھی۔نہ عبادت سکون بخش تھی اور نہ مریضوں کی دیکھ بھال۔

وزنی ہتھوڑے کی ضربیں کھاتے کھاتے وہ بے دم ہو چکے تھے۔یہ تلخ احساس کہ زرغونہ سٹیج پر تھرکنے اور ناچنے والی ایک لڑکی ہے،اُن کی پرسکون زندگی میں ترشی ہی ترشی آگئی تھی۔

گل باز خان اور دیگر ملازم حیران تھے۔کلینک کا عملہ بھی اس تبدیلی کو محسوس کر رہا تھا۔اور سب سے بڑھ کر ان کے مریض جوان کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھتے ہی اپنے دکھ درد بھول جاتے تھے۔ہر فرد متاثر تھا۔۔۔آ کا یہاں تھے نہیں جوان سے پیار بھرا اصرار کر کے کچھ اگلوا ہی لیتے۔

وہ کسی گیلی لکڑی کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہے تھے۔اور دھوئیں کی کڑواہٹ ان کی آنکھوں اور سارے وجود پر اثر انداز ہو رہی تھی۔

زرغونہ کی حالت کچھ اس سے مختلف نہ تھی ۔زخموں سے خون رس رہا تھا۔دل کے داغ اور بھی گہرے ہو گئے تھے ۔منزل نزدیک ہوتے ہوئے بھی کوسوں دور تھی ۔اور ان سب کے ساتھ ساتھ یہ خوف بھی دامن گیر تھا کہ کہیں احسن اس کی اصلیت جان نہ گئے ہوں ۔زیر تکمیل فلم کی شوٹنگ مکمل ہوئی ۔اور وہ پہاڑ پر جانے کے لیے تیار تھی ۔

پہاڑی علاقہ دھند اور کہر میں لپٹا ہوا تھا۔خنک ہوائیں سنسناتی ہوئی سینے کے آر پار ہوئی جاتی تھیں ۔سر کو اونی مفلر سے لپیٹے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالے کندھے پر سفری بیگ لٹکائے وہ اونچی نیچی پگ ڈنڈیوں پر کبھی تیز رفتاری اور کبھی ست روی سے چل رہی تھی ۔اس کا کندھا درد کر رہا تھا۔بیگ خاصا وزنی تھا اس میں کیا کچھ نہ تھا۔احسن کے لئے پھل تھے ۔دو درجن سفید دستی رومال خود بنا لائی تھی ۔چند جوڑے اپنے کپڑوں کے تھے ۔اور ابھی برقعہ بنگلے پر پھینک آئی تھی ۔

کاٹیج کے قریب پہنچ کر اس کا دل شدت سے دھڑ کا۔خوف کے ٹھنڈے سائے چہرے پر چھا گئے ۔شہابی رنگ سفیدی میں بدل گیا ۔لرزتے قدموں سے وہ اندر داخل ہوئی ۔ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے سب کمرے خالی تھے ۔احسن اپنے کمرے میں نہیں تھے ۔تیزی سے کمرے سے نکلی تبھی ۔گلباز نظر آیا۔اس کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اس نے احسن کے متعلق دریافت کیا۔

''وہ کونے والے کمرے میں ہیں۔''اس نے جواب دیا۔

دروازے کا پردہ اٹھایا۔سامنے آرام کرسی پر نیم دراز احسن سوالیہ انداز میں نگاہیں اٹھائے نظر آئے۔

نگاہوں سے نگاہوں کا تصادم ہوا۔

ان کی آنکھوں میں ٹھنڈک تھی ۔لبوں پر گہرا سکوت تھا۔اور یہ ٹھنڈک اس کے جسم

میں اترنے لگی۔

دروازے کا پردہ ہاتھ میں پکڑے وہ پتھر کے بت کی طرح کھڑی تھی۔

''آہ !''اس کے ہونٹوں سے دردناک کراہ نکلی۔

پھیلا ہوا دامن اتنی جلدی سمیٹنا پڑے گا۔یہ حادثہ متوقع تھا۔ایک نہ ایک دن اسے اس صورت حال کا سامنا کرنا ہی تھا۔

لیکن وہ پھر بھی خود کو دھوکا دیتی رہی تھی۔

احسن کی آنکھوں میں خنکی ختم ہوگئی تھی۔نفرت وحقارت کی بجلیاں تڑپنے لگیں۔پہلو بدلا اور بے قرار سے کھڑے ہوگئے۔

''میرا خیال ہے جو ناٹک تم نے کھیلا ہے اسے اب انجام پذیر ہو جانا چاہیے۔''ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

''ناٹک !''اس کے ذہن پر وزنی ہتھوڑے کی چوٹ پڑی۔

''ناٹک !''اس نے کرب سے سوچا۔

''ناٹک !''وہ ڈوبتی آواز میں خود سے بولی۔

''ناٹک کھیلا ہے؟''اس نے اپنے دل سے سوال کیا۔

''اپنی زندگی سے کبھی کسی نے ناٹک نہیں کھیلا احسن !اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''زرغونہ !یہ مت بھولو یہ میرا گھر ہے سٹیج نہیں اور میں ایک ایک غیور انسان ہوں۔فلمی اداکار نہیں۔''

ان کے جسم کا رواں رواں کھڑا تھا۔جوش غضب سے ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں؟''لہجے میں شک نمایاں تھا۔

''تم .....؟تم پر اعتماد؟ جو چند سکوں کے لئے سٹیج پر ناچتی اور تھرکتی ہے۔جسم کی نمائش کرتی ہے اور ایک روپے سے لے کر چھ آنے تک کا مزدور جسے دیکھتا ہے۔قہقہے لگاتا ہے اور آوازیں کستا ہے۔''

ان کی آنکھوں سے شعلوں کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔

''تم جیسی پست کردار اور بے ننگ و ناموس لڑکی پر اعتماد؟''

ان کی انگشت شہادت اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

''پست کردار !''اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں گھورا۔

''اس کا کردار پست ہے۔۔۔اس کا.....''ذہن میں بگولے اٹھے۔

''یہ کردار تو رنڈی کے کوٹھے پر بھی محفوظ رہا۔اس کردار نے اپنی حفاظت کی پاداش میں ننگی پیٹھ پر لوہے کی گرم سلاخیں تک لگوائیں۔نواب داؤد کی تنی ہوئی گردن توڑی ۔۔۔۔۔یہ کردار جو جنم دینے والی ماں کی آنکھوں میں کھٹکتا خار بن گیا۔آج اس کردار چیلنج کیا گیا۔میں ایسے ہزاروں پیار اپنی آن اور وقار پر قربان کرسکتی ہوں۔

اس کے ذہن میں طوفان اٹھ رہے تھے۔

ایک پل میں اس کی حالت بدل چکی تھی۔غصے سے ابلتی آنکھوں سے اس نے احسن کو گھورا اور چلائی۔

''آپ کی دنیا کے شریف زادے اور شریف زادیاں میں بھلا انھیں کہاں جانتی ہوں؟میرا فلموں میں کام کرنا اگر آپ کی غیرت وحمیت پر ایک تازیانہ ہے تو اس کی ضرب کو اور میں گہرا کرنا چاہتی ہوں۔میں ایک طوائف کی بیٹی ہوں۔بازار کی پیداوار ہوں اور اس کوٹھے سے آپ کی پاکیزہ دنیا کو غلیظ کرنے کے لیے آئی ہوں۔''اس کا ایک ایک لفظ طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔

ان کی آنکھیں خوفناک حد تک پھیل گئی تھیں ۔ہونٹ سفید پڑ گئے تھے ۔

''لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں مجھے کس جرم میں شکار کیا گیا ؟ کیا شہروں کے لوگ ختم ہو گئے تھے جو تم ایک اچھے بھلے انسان کا ذہنی سکون تباہ کرنے چلی آئیں ؟''

''یہ کون جانتا ہے کہ میں نے کسی کو شکار کیا ہے یا خود ہی شکار ہو گئی ہوں ۔''

ان کے تن بدن میں آگ لگ اٹھی ۔

''یہ ڈائیلاگ اپنے تماشائیوں کے لئے محفوظ رکھو مجھے ان سے مرغوب کرنے کی ضرورت نہیں ۔''

وہ زہر اگل رہے تھے ۔

''میں خواہشمند بھی نہیں ۔''اس نے بھی جواب دیا ۔

''تم جا سکتی ہو ۔''انہوں نے یہ کہتے ہوئے منہ پھیر لیا ۔

''میں ٹھہروں گی نہیں مطمئن رہیے ۔لیکن جانے سے قبل میں یہ ضرور کہنا چاہتی ہوں کہ وہ خدا جس کی آپ عبادت کرتے ہیں وہ اپنے اعجاز دنیا پر ظاہر کرتا چلا آیا ہے ۔آک کے پودے پر کبھی کبھی آم لگ جاتے ہیں ۔کیچڑ میں کنول کھلتے ہیں اور کسی رنڈی کے کوٹھے پر ماحول سے بغاوت کرنے والا ایک پاکیزہ عنصر پیدا ہوتا ہے ۔''

''کوئلوں کی کان میں رہتے ہوئے اور گناہوں کے غار میں زندگی بسر کرتے ہوئے بھی اپنی پارسائی کا دعویٰ ہے ۔''

ان کے ہونٹوں پر زہریلا تمسخر تھا۔

''پارسائی کیا آپ کی خاندانی میراث ہے؟ بپھرے ہوئے اس نے کہا۔مڑی، پردے کو جھٹکا دیا اور تیزی سے باہر نکل گئی ۔

باب نمبر:۳۱

شام کی خنک تیز ہوائیں اسے اپنے ساتھ اڑائے لیے جا رہی تھیں۔راستوں کے پیچ وخم سے بے نیاز وہ ٹیڑھے میڑھے پہاڑی راستوں پر بھاگی جا رہی تھی۔اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔اس کا چہرہ ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑوں سے سرخ ہو رہا تھا۔کندھے پر لٹکا ہوا سفری بیگ جانے کہاں گر گیا تھا؟اونی مفلر نصف سے زیادہ پشت پر لٹک رہا تھا۔

سائیں سائیں کرتی ہوا فضا میں طنز کے شرارے اڑا رہی تھی۔

''تم.....تم پر اعتماد۔تم جیسی پست کردار لڑکی پر اعتماد۔کوئلوں کی کان میں رہتے ہوئے اور گناہوں کے غار میں زندگی بسر کرتے ہوئے بھی پارسائی کا دعوی ہے۔

نفرت کی یہ چنگاریاں اور طنز کے یہ شرارے اس کے دائیں بائیں گر رہے تھے۔پیچھے سے لپک رہے تھے آگے سے راستہ روک رہے تھے۔حرارت بڑھ رہی تھی اور وہ ایک دہکتا تنور بنتی جا رہی تھی۔

بنگلے پر پہنچ کر کار میں بیٹھی تو یوں لگا جیسے کار ایک پل میں اس کی گرمی سے جل کر

راکھ ہو جائے گی۔

رات کے نو بجے جب شوفر نے خوب صورت کوٹھی کے پورچ میں جا کر کار روکی اس وقت تک دھکتا تنور ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

شوفر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد محبت بھری آواز اس نے سنی۔

''زرغونہ !تم اتنی جلدی کیسے چلی آئیں؟''

پٹ کھول کر وہ اندر آ گئی۔اس کے قریب سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔وہ برف ہو رہے تھے۔گھبرا کر اس نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیا وہ بھی یخ تھا۔کار کی مدھم مدھم روشنی میں اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔وہاں آنسو منجمد ہو چکے تھے۔سکتے کی سی کیفیت اس پر طاری تھی۔

زرغونہ !زرغونہ !اس نے بے قرار ہو کر اسے اپنی گود میں سمیٹ لیا۔اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے وہ بار بار اسے پکار رہی تھی۔

اور محبت کی گرمی سے وہ پگھل اٹھی ۔۔۔۔بلک بلک کر رو دی۔سمیعہ اس سے کچھ سنے بغیر ہی سمجھ گئی تھی کہ طوفان آ چکا ہے۔

''زرغونہ !حوصلے سے کام لو''۔۔۔۔سمیعہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''چلو کمرے میں۔''اس نے بمشکل اُسے کار سے اتارا۔

اسے بازوؤں میں سمیٹے کار کا پٹ بند کرنے کو بڑھی تو شوفر قریب آ گیا۔

''آپ رہنے دیجئے۔''اس نے کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا اور مودبانہ لہجے میں بولا۔

''میرے لیے کیا حکم ہے؟''

سمیعہ نے کچھ سوچا اور بولی۔

کار کو یہیں رہنے دو اور تم ہمارے ڈرائیور کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ تمہارے لیے باورچی خانے سے کھانا لے جائے۔اور رات اسی کے ساتھ گزارو۔"

"بہتر حضور!"

وہ اُسے ساتھ لئے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گھر کی پچھلی طرف سے اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس حالت میں اپنے گھر میں اس کی آمد کو وہ گھر والوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی۔گھر میں چند مہمان آئے ہوئے تھے۔

آرام سے اس نے اسے بستر پر لٹا دیا۔

وہ روتی رہی۔دبی دبی سسکیاں کمرے کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کرتی رہیں۔اور وہ اس کے پاس کھڑی دکھ سے اسے دیکھتی رہی۔اس نے اُسے خاموش کروانے کی کوشش نہیں کی۔چاہتی تھی کہ ذہن پر چھایا غبار اتر جائے۔

کافی دیر گزر جانے کے بعد اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور آہستہ آہستہ اپنی انگلیاں اس کے بالوں میں پھیرتے ہوئے بولی۔

"زرغونہ! کوئی انہونی بات تو نہیں ہوئی۔تم تو ایک دن اس کی متوقع ہی تھیں۔"

"ٹھیک کہتی ہو سمیعہ!۔۔۔۔اس نے آنسو بھری آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

یہ اندھیرے اور اجالے کب ساتھ ساتھ چلے ہیں؟ یہ تو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔"اس کی آنکھوں کے جلتے دیئے بجھ گئے تھے۔اس کی آواز میں حسرت کی تڑپ تھی۔سمیعہ کا دل کٹ کے رہ گیا۔جی چاہا کاش خوشیوں کے خزانے کی چابی اس کے پاس

ہوتی تو وہ ساری خوشیاں زرغونہ پر نچھاور کر دیتی۔

''احسن کو تمہارے متعلق کس بات کا علم ہوا ہے؟''

''ناچنے اور تھرکنے کے متعلق وہ جان چکے ہیں اور کوٹھے کا میں انہیں بتا آئی ہو۔''۔۔۔زہریلے لہجے میں بولی۔

''تم نے یہ کیا غضب کیا !''سمیعہ فوراً بول اٹھی۔

''قدرت ہی غضب کرنے پر تلی ہوئی ہے۔میں نے اگر کر دیا تو کیا ہوا؟''

''تم نے غلطی کی زرغونہ !''

''میں اس غلطی پر پشیمان نہیں۔''

''احسن نے تمہیں کیا کہا؟''

''یہ پوچھو کیا نہیں کہا؟''اس نے دکھی نگاہیں سمیعہ کے چہرے پر جما دیں تھوڑی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔اور پھر یاس آمیز لہجے میں بولی۔

''سمیعہ !مجھے سمجھاؤ، میں حقیقت سے فرار کیوں چاہتی ہوں؟طوائف کی بندی پیشانی پر چپکی ہوئی ہے۔مجھے بتاؤ میں اسے کبھی نہیں اتار سکتی۔مجھے یہ ذہن نشین کرواؤ۔ لوگ کہتے ہیں میں گناہوں کے غار میں زندگی بسر کر رہی ہوں پھر بھی مجھے پارسائی کا دعویٰ ہے۔''

''سمیعہ !''وہ اس کے شانوں پر سر رکھے چیخ اٹھی۔

''تم تو میری مخلص دوست ہو۔تم ہی مجھے سمجھاؤ کیا میں یہ دعویٰ چھوڑ دوں؟''بے چین ہو کر سمیعہ نے اس چہرہ اپنے شانوں سے اٹھایا۔اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے وہ سسک اٹھی۔

''تمہارا کردار پھولوں سے بھی زیادہ پوتر ہے زرغونہ !میں یہ سب تمہیں کیوں

کہوں جب کہ حقیقت نہیں، سمجھنے والے تو سمجھتے ہیں۔"

''حقیقت؟''اس کی آواز ڈوب رہی تھی۔

''حقیقت سے تو تخلیق کرنے والا بھی بے خبر ہے۔انسان اسے کیا سمجھیں گے؟''

''لیکن زرغونہ تمہیں احسن سے اُلجھنا نہیں چاہیے تھا۔''

''کیوں؟''وہ یک دم کھڑی ہوگئی۔ڈوبتی آواز میں جوش عود آیا تھا۔

فخر و امتیاز کا وہ احساس جو آج کے سانحہ سے زخمی ہو کر تڑپ رہا تھا،سمعیہ کی اس بات پر تلملا کر لہرایا۔اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں وہ شان چمکی جس پر اسے ناز تھا۔اس نے گردن کو پیچھے کی طرف ایک خفیف سا جھٹکا دیا اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔

''وہ کیا پارسائی کو اپنی خاندانی میراث سمجھتے ہیں؟میں کیا نہیں جانتی؟میں نے کیا نہیں دیکھا؟یہ نام نہاد اونچے شریف گھرانے اور ان کے سازگار ماحول۔''ایک لمحے کے لیے رک کر ان نے سمیعہ کو دیکھا۔

اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔اس کے الفاظ میں زمانے بھر کا طنز بھرا ہوا تھا۔

''ان کے رخ سے پردہ اٹھاؤ تو کھوکھلے کردار نظر آئیں گے۔لیکن یہ شریفوں کی دنیا ہے۔اس میں پارسا رہتے ہیں۔یہ پرہیزگاروں کا مسکن ہے۔''

ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے سمعیہ اس کے جلال کو دیکھ رہی تھی۔کیا کہتی؟وہ کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی تھی۔لیکن احسن تو خطاوار نہ تھے۔

''زرغونہ!حقائق کا تجزیہ کرو تو تم خود کو حق بجانب نہ پاؤ گی۔''اس کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔

زرغونہ نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔سمعیہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے

بولی۔

''تم نے اُن کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔تم نے خود کو چھپایا۔پہلی ملاقات میں ہی تمہیں خود کو ظاہر کر دینا چاہیے تھا۔''

''تمہارا خیال ہے خود کو ظاہر کرتی۔گڑگڑاتی پاؤں پڑتی اور محبت کی بھیک مانگتی۔کیوں؟''

''اگر تم انہیں سارے حالات تفصیلاً بتلا دیتیں تو میں نہیں سمجھتی کہ احسن تم پر اعتماد نہ کرتے۔''

''کیوں نہیں؟''اس کے ہونٹوں اور آنکھوں میں زہریلا تمسخر نمودار تھا۔

''ضرور کرتے۔گومگو میں ڈوبنے کے بعد جب باہر نکلتے تو میری بے بسی پر رحم کھاتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیتے۔مجھے بے بسی سے نفرت ہے نفرت.............نفرت ہے۔''

وہ اضطراری حالت میں سر جھٹک رہی تھی۔اس کا وجود کسی خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

''میں اگر بے بسی کو قبول کر لیتی تو آج تمہارے سامنے نہ ہوتی بازارِ حسن میرا مقام ہوتا۔''

''سمعیہ !میں نے احسن سے دل کا سودا کیا ہے۔اور لین دین میں خیرات نہیں چلا کرتی۔''

وہ اوندھے منہ بستر پر گر گئی تھی۔

باب نمبر:۳۲

ان کی ذہنی دنیا زلزلوں کے شدید جھٹکوں سے ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔وہ ایک ایسے طوفان میں خود کو گھرا محسوس کر رہے تھے جس میں انہیں اپنی حیثیت کسی پتے کی مانند نظر آ رہی تھی۔۔۔اس پتے کی مانند جو شاخ سے ٹوٹ کر بے سہارا رہ جاتا ہے۔

کمرے میں جلتا گیس اور دودھیا روشنی میں انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

ایک ہی خیال دماغ میں کچوکے لگا رہا تھا۔

''میرا مقدس پیار کانچ کے بے رنگ ٹکڑوں پر اتر آیا۔طوائف کی بیٹی اور خود بھی طوائف، کیسے یقین کر لوں اس کا دامن گندگی سے پاک ہے۔مجھ سے کھیلا گیا ہے، مجھے فریب میں رکھا گیا ہے۔اپنی اصلیت کو مجھ سے چھپایا گیا ہے۔یہ سب کیا ہے؟ یہ دھوکا نہیں !اور اس پر بھی فطرت کے اعجاز کا حوالہ دیا گیا۔''

کمرے کی دیواریں سرعت سے اپنی طرف بڑھتی محسوس ہوئیں۔

گھٹن و شدید گھٹن کا انہیں احساس ہو رہا تھا۔یوں لگ رہا تھا۔جیسے وہ کمرے کی

اس گھٹی فضا میں دم توڑ بیٹھیں گے ۔دیوانہ وار باہر نکل آئے ۔

سرما کی زرد زرد بیمار چاندنی ۔انہوں نے نظر بھر کر ماحول کے اجاڑ پن کو دیکھا۔

دل میں ٹیس اٹھنے لگیں ۔

کوئی یاد آیا تھا۔کسی کی مسکراہٹ انگاروں پر لوٹا گئی تھی ۔

''رنڈی کے کوٹھے کی ایک پرہیز گار تخلیق ۔۔۔۔بہت خوب۔'' وہ خود بخود بڑبڑائے ۔

ان کی نظروں کے سامنے ایک سے ایک بڑھ کر تلخ حقائق تھے۔''بڑھتے ہوئے ہاتھ،آنکھوں میں ناچتی ہوس،فلم انڈسٹری کا پر شباب ماحول اور کسی جام کی طرح چھلکتا ہوا اس کا لافانی حسن،پرہیز گاری کا تصور ہی مضحکہ خیز ہے۔''

اور جس والہانہ انداز سے وہ ان کی طرف بڑھی تھی وہ بھی آنکھوں کے سامنے تھا۔ماحول پر مسلط اتنی خنکی کے باوجود ان کے جسم میں آگ لگی ہوئی تھی ۔آہ اتنے پیارے احساسات ۔اتنا گہرا قلبی لگاؤ اس سے جس کا کام ہی شکار کرنا ہے اور جسے اس فن کی تعلیم ورثے میں ملی ہے ۔

کیچڑ میں اُگا کنول تصور میں ابھرا۔کنول جو غلاظت میں آنکھ کھولتا ہے،گندگی میں پروان چڑھتا ہے ۔لیکن اپنی تقدیس برقرار رکھتا ہے ۔سفید سفید مقدس پھولوں کی پاکیزگی نے ان کے کھولتے ہوئے جذبات پر انسانیت کی ایک بوند گرائی ۔

لیکن بھڑکتے لاوے پر ایک بوند پڑی اور بھک سے بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہوگئی ۔

آک کے پودوں میں آم اور طوائف کے بطن سے پاکیزہ تخلیق ۔فطرت کا اعجاز بن کر سامنے آئی اور دور ہٹتی چلی گئی ۔

مذہب سے گہرا لگاؤ رکھنے والا نوجوان قدرت کے ان مظاہر پر ایمان لانے کو تیار نہ تھا۔

تصورات کے زہر یلے سانپ ان کے جسم کے ایک ایک حصے کو نوچ رہے تھے اور وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا رہے تھے۔

رات گزرتی جارہی تھی اور وہ اپنا ذہنی توازن کھوتے جارہے تھے۔صبح ہونے تک وہ برسوں کے مریض نظر آرہے تھے۔ان کی اس ابتر حالت کو دیکھ کر ملازم گھبرا اٹھے۔کلینک اطلاع کی گئی۔ڈاکٹر اور کمپونڈر سبھی بھاگے بھاگے آئے۔اور دوپہر ہونے سے پہلے پہلے انہیں شہر لایا گیا۔نعیم اور یاسمین کو اطلاع کی گئی۔ان کی بیماری کا سن کر دونوں میاں بیوی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔آئے اور اسے ذہنی طور پر غائب پا کر ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

گلباز خان سے تنہائی میں جو باتیں انہیں معلوم ہوئیں، وہ بے چینی میں اضافہ کر گئیں۔

''وہ لڑکی کون ہے؟''نعیم نے تیسری بار مضطرب لہجے میں پوچھا۔

''میں خود نہیں جانتا۔وہ کبھی کبھی صاحب سے کو ملنے آیا کرتی تھیں۔''ملازم نے گھبرائے گھبرائے انداز میں ۔۔۔۔۔جواب دیا۔

''ان کے پاس رات کو بھی رہا کرتی تھی۔''

''ہفتوں رہتی تھیں۔''

''آخری بار کب آئی؟''نعیم نے کسی وکیل کی طرح جرح کی۔

''بس کل شام آئی تھیں تھوڑی دیر ٹھہری۔صاحب اور ان میں تیز تیز باتیں ہوئیں اور اس کے بعد وہ چلی گئیں۔''

''اس کا نام کیا ہے؟'' یاسمین نے پوچھا۔

''صاحب اسے زرغونہ کہا کرتے تھے۔''

''شکل وصورت کی کیسی تھیں؟''۔۔۔۔یاسمین نے دوبارہ استفسار کیا۔

''بیگم صاحبہ، بہت خوبصورت تھی۔جیسے چاند کا ٹکرہ۔''

میاں بیوی کی عقل اس گتھی کو سلجھانے سے قاصر تھی۔احسن نے کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔اور وہ بھی بخوبی جانتے تھے کہ ان کی زندگی میں کسی عورت کے لئے کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔وہ تو اپنے پیشے میں اس حد تک ڈوب چکے تھے کہ اس سے باہر کی دنیا میں جھانکنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔

''صاحب وہ ایسے تو کبھی نہ تھے۔شہر آئے اور جانے یہاں کیا ہوا؟ جب واپس گئے تو وہ احسن میاں معلوم ہی نہ ہوتے تھے۔خاموش خاموش اور پریشان سے۔ہم سب فکر کرتے تھے کہ انہیں کیا ہو گیا ہے؟''

یاسمین کا ماتھا ٹھنکا۔شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں نے آپ کو آپ کی بیماری کی وجہ سے بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ احسن یہاں بھی بیمار ہوئے تھے۔''

''کیا تکلیف ہوئی تھی؟ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

ساری تفصیل یاسمین نے اس کے گوش گزار دی۔

''تم نے غلطی کی یاسمین ! جو مجھے اس سے لاعلم رکھا۔''انہوں نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

''دراصل خدشہ تھا کہ آپ اس سے بہت اثر لیں گے۔''

بہر حال بات کو وہیں چھوڑ دیا گیا۔فوری مسئلہ احسن کی صحت کا تھا۔تندہی سے

دونوں ان کی خدمت میں لگ گئے دن کا چین اور راتوں کی نیند ان پر حرام ہوگئی ۔ہذیانی حالت میں کبھی کبھی احسن کی زبان سے زرغونہ کا لفظ نکلتا۔

گلباز خان سے انہوں نے پھر تفصیلی گفتگو کی۔ ساری داستان سننے کے بعد وہ کسی حد تک بیماری کی وجہ سمجھ گئے تھے ۔یہ مسئلہ ابھی وہیں تھا کہ تعلقات بگڑنے کا سبب کیا تھا؟

اب وہ زرغونہ کو ڈھونڈنا چاہتے تھے۔گلباز کو بنگلے پر خیر خبر لانے کے لیے بھیجا تو اس نے آکر بتایا۔"بوڑھا ملازم نیا ہے وہ جانتا نہیں۔"

نعیم خود گئے، لیکن ناکام لوٹے۔خبطی سا نوکر تھا۔اُلجھا بیکار سمجھا۔

احسن کے ٹھیک ہونے کی رفتار بہت سست تھی۔ابھی تک ہسپتال میں ہی تھے۔

یاسمین تھوڑی دیر قبل ہسپتال سے آئی تھی ۔اور اب باورچی خانے میں رات کا کھانا دیکھ رہی تھی ۔

"بیگم صاحب.......بیگم صاحبہ !گلباز باورچی خانے میں داخل ہوا۔

"کیا بات ہے؟"یاسمین نے اس کی طرف دیکھا۔اس کا سانس پھول رہا تھا۔اس کا چہرہ سرخ تھا اور اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

وہ کہیں سے غالباً بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔

"وہ جو بیگم صاحبہ صاحب کے پاس آیا کرتی تھیں ۔ان کو آج میں نے دیکھا ہے۔"

"کہاں؟"یاسمین نے بے صبری سے پوچھا۔

"بیگم صاحبہ !وہ تو فلموں میں کام کرتی ہیں ۔میں فلم دیکھنے گیا تھا۔اس میں وہ تھیں۔"

"فلم میں؟"وہ ہکا بکا رہ گئی۔کیتلی ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچی۔

''ٹھیک کہتے ہو۔اچھی طرح پہچانا ہے نا !''اس نے مشکوک لہجے میں دوبارہ پوچھا۔

کیسے نہ پہچانوں گا بیگم صاحبہ !اتنے دن وہ ہمارے ساتھ رہیں۔''

''کون سی فلم دیکھ کر آئے ہو؟''

''چاند''

بہت خوبصورت ۔دبلی پتلی کٹے ہوئے بالوں اور موٹی موٹی آنکھوں والی لڑکی ۔۔۔وہی ہے نا ؟اس نے تیزی سے اسے حلیہ بتایا۔

''ہاں ہاں بیگم صاحبہ وہی۔''نوکر نے اثبات میں زورزور سے سر ہلایا۔

''تم جاؤ اور دیکھو !کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''بہت اچھا !''وہ باہر آ گیا۔

''ہوں تو زرغونہ دراصل سبینہ ہے۔''اب وہ صورتحال کو سمجھ گئی تھی۔وہ اس کی محبوب اداکارہ تھی۔اس کے متعلق بہت سی افواہیں اس نے بھی سنی تھیں۔اس کی بد دماغی محفلوں میں اس کی عدم شرکت اور الگ تھلگ زندگی کی۔وہ فلمی دنیا میں واحد ہستی تھی جو ہر لحاظ سے منفرد تھی۔اور اس کے مداح اس کے متعلق بہت سی معلومات رکھتے تھے۔

باب نمبر:۳۳

تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ہمیں سیدھا راستہ دکھا ! ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے اپنا انعام نازل کیا، نہ کہ ان لوگوں کا راستہ جو تیرے غضب میں مبتلا ہوئے،اور نہ گمراہوں کا۔"

سورۃ فاتحہ کی ان آیات کے ساتھ اس نے اپنی نماز ختم کی ۔اور جائے نماز سے اٹھ گئی ۔میز کی طرف آئی جہاں کتابوں کا ڈھیر بے ترتیبی سے پڑا تھا۔آرام کرسی پر چوکڑی مار کر بیٹھتے ہوئے اس نے حساب کی کتاب اٹھائی اور سوال حل کرنے لگی ۔

وہ انٹرنس کے امتحان میں بیٹھ رہی تھی ۔

''زرغونہ بی بی آپ سے کوئی خاتون ملنے آئی ہیں ۔''

خادمہ نے ڈرتے ڈرتے تعارفی کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

اس نے غصیلے انداز میں خادمہ کو گھورا اور تلخی سے بولی ۔

''میں نے تم سے کیا کہہ رکھا ہے؟''

''زرغونہ بی بی میں کیا کروں؟ وہ بہت ضدی عورت معلوم ہوتی ہے۔''

''کہہ دو میری طبیعت ٹھیک نہیں۔''

کتاب کے اوراق الٹتے ہوئے اس نے بیزاری سے کہا۔اس کی طبیعت اچاٹ ہوگئی تھی۔دکھ سے وہ سوچ رہی تھی۔

''ماں نامی گرامی طوائف تھی اور بیٹی نامی فلم سٹار۔اس کے دروازے پر بھی اس کے مداحوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔اور میرے در پر بھی میرے مداحوں کا۔جن کا جس وقت اور جب جی چاہتا ہے منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔میرے پرستار میری صورت کے شیدائی، میرے فن کے قدردان اور مجھے اپنے دلوں کی دھڑکنوں میں بسانے والے میرے پجاری۔''اس کے ہونٹوں اور آنکھوں میں طنز کا زہر بکھرا ہوا تھا۔

''احسن رضا۔''وہ مدھم آواز میں خود سے بولی۔

''مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں کوئی شکوہ نہیں۔غیور اور غیرت مند انسان کی حیثیت سے تمہارا ردعمل فطری تھا۔''

''زرغونہ بی بی اس نے یہ چٹ دی ہے۔''ملازمہ سہمی ہوئی تھی۔

چٹ اس کے ہاتھ سے پکڑی، پڑھی، پلکیں تیزی سے جھپکائیں حروف دوبارہ پڑھے،چہرے پر حیرانی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔

تم انہیں بٹھاؤ۔میں آرہی ہوں۔''چٹ پر چوتھی بار اس کی نظریں دوڑ رہی تھیں۔

''میں احسن رضا کی عزیز ہوں اور آپ سے فوری ملنا چاہتی ہوں۔بیگم یاسمین نعیم۔''

اور جب کامنی سی ایک لڑکی جس کے چہرے پر معصومیت کا نور تھا کمرے میں داخل ہوئی تو یاسمین بے اختیار کھڑی ہوگئی۔اتنا حسین چہرہ وہ ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی

تھی۔

اُداس اُداس آنکھوں سے زرغونہ نے چند بار اُسے دیکھا اور یوں گم صم دیکھ کر چند لمحے کھڑے رہنے کے بعد یہ کہتے ہوئے بیٹھ گئی۔

''تشریف رکھیے۔''

''میں عرصہ سے آپ کی دید کی متمنی تھی۔مصروفیات کچھ اتنی زیادہ تھیں کہ چاہتے ہوئے بھی نہ آسکی۔''

یاسمین نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

''شکریہ !زرغونہ کا جواب مختصر تھا۔

''میں آپ کے لئے اجنبی ہوں۔گو ایک نامی اداکارہ ہونے کی حیثیت سے آپ میرے لیے اجنبی نہیں۔لیکن جہاں تک آپ کے نجی حالات کا تعلق ہے۔میں آپ کے متعلق قطعی لاعلم ہوں۔احسن اگر بیمار ہوکر ہمارے پاس نہ آتے تو شاید آپ سے ملاقات کی نوعیت مختلف ہوتی۔''

''احسن بیمار ہیں؟''۔۔۔۔۔۔زرغونہ نے تڑپ کر پوچھا۔

''جی ہاں انہیں شدید دماغی صدمہ پہنچا ہے۔گو وہ ابھی بہتر حالت میں نہیں ہیں لیکن اب خطرے سے باہر ہیں۔''

اس کا چہرہ زردیوں میں ڈوب رہا تھا۔یاسمین گہری تنقیدی نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔وہ تعلقات کی تہہ میں اتر کر معلوم کرنا چاہتی تھی کہ خلوص سطحی ہے۔۔۔محض احسن سے کھیلا گیا ہے یا خود کو بھی ہار بیٹھی ہے۔

''زرغونہ !میں پوچھنا چاہتی ہوں۔احسن کی بیماری کا ذمہ دار کون ہے؟''

''آپ کو میرے متعلق انہوں نے بتایا ہے؟'' ایک عجیب سی بے قراری کے

ساتھ اس نے پوچھا۔

''نہیں کوشش بسیار کے باوجود میں احسن سے ایک لفظ بھی اگلوا نہ سکی۔ گلباز سے حالات معلوم ہوئے ہیں۔''

زرغونہ کے دونوں ہونٹ ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں ویرانی تھی۔

''کیا؟''

اس ''کیا'' میں ایک درد بھرا استفسار تھا۔

''زرغونہ دنیا کو ایک عظیم انسان سے جو لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کا مسیحا ہے محروم نہیں ہونا چاہئے۔ میرا خیال ہے آپ بخوبی سمجھتی ہیں کہ احسن کی ذہنی تکلیف کی ذمہ دار فقط آپ ہیں۔ وہ کونسے عناصر ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں تا کہ اس کا مداوا کیا جا سکے۔'' یاسمین کی آواز میں محبت اور شفقت تھی۔

وہ دل گرفتہ سی نظر آ رہی تھی۔ کچھ تذبذب کا سا عالم طاری تھا۔

''مجھ سے بلا تکلف بات کرو۔ میں احسن کی عزیز ہی نہیں تمہاری بھی عزیز ہوں۔''

اس نے بھرپور اپنائیت سے کہا۔ سولہ سترہ سالہ لڑکی کو آپ آپ سے مخاطب کرنا اُسے کچھ اتنا اچھا نہ لگا۔

''آپ مجھ پر اعتماد کریں گی؟''

''کیوں نہیں؟ اتنا معصوم چہرہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ مجھے یقین ہے۔'' یاسمین نے بھرپور اعتماد سے کہا۔

''یہ میری خود غرضی تھی کہ میں نے انہیں تاریکی میں رکھا۔ ان کے بار ہا پوچھنے پر

بھی خود کو بے نقاب نہ کیا۔لیکن جب حقیقت کا تجزیہ کرتی ہوں تو خود کو بھی قصوروار نہیں پاتی ۔خدا کا اگر کوئی مادی وجود ہوتا تو میں اس کے سامنے بیٹھ کر یہ پوچھتی کہ مجھے غلاظت کے ڈھیر پر پھینکنے میں اس کی کیا مصلحت تھی؟اور اگر پھینکنا ہی تھا تو ذہن بھی غلاظت سے پیار رکھنے والا دیا ہوتا۔اس کی آواز جذبات سے بوجھل تھی،اس کی آنکھوں سے آنسو امڈ رہے تھے جنہیں وہ واپس لوٹانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی ۔لیکن فاصلہ طے کر کے پلکوں کے کناروں تک آ پہنچنے والے آنسو واپس جانے پر تیار نہ تھے ۔تیزی سے لڑھک گئے ۔ڈوبتی ابھرتی آواز میں اس نے سب کچھ یاسمین کو بتا دیا۔

ان کے ساتھ جھگڑے کے بعد جب میں واپس آئی تو میرے ذہن میں کرب ناک خیالات کی یلغار تھی ۔کبھی احسن کی باتیں ناگ کی طرح کاٹتیں اور کبھی اپنا طرز سلوک بچھو کے ڈنک لگاتا۔

''احسن بیمار ہیں۔ان کی زندگی کا یہ پہلا سانحہ ہے۔لیکن میں تو ان قیامتوں سے گزر چکی ہوں !''

اس کی آنکھوں سے پانی کے سوتے ابل پڑے۔

یاسمین نے اپنی آنکھیں خشک کیں ۔اس کا بازو پکڑا اور اسے سامنے سے اٹھا کر صوفے پر بالکل اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

''آپ بتایئے......نا ۔''اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''چاہے جانے کی تمنا اگر جرم ہے تو میں مجرم ہوں ۔ان کے لیے دھوکا دینا اگر فریب ہے تو میں سزاوار ہوں ۔مجھے اپنی زیادتی کا احساس ہے ۔لیکن میں بھی تو مجبور تھی ۔''

اس نے سر صوفے کی پٹی پر رکھ لیا ۔اور دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرنے لگی ۔تھوڑی دیر بعد نشست سیدھی کرتے ہوئے اس نے یاسمین کو دیکھا۔اور بھرائی ہوئی

آواز میں بولی۔

احسن میری حیات کا منتہائے مقصود تھے۔ان کی رفاقت میرے لیے مقدر کا ایک حسین ترین تحفہ تھی۔''

''آپ سوچئے نا!''اس کی آنکھوں میں احساسات کے کتنے رنگ تھے۔یاسمین کو بے اختیار اس پر پیار آیا۔

''میں جب ان سے ملی ،قدرت نے کچھ دیر کے لیے مجھے خوشیوں کی پیش کش کی تو میں اسے کیسے مسترد کر دیتی۔میں نے انہیں تاریکی میں رکھا کیونکہ میں درد دینا اور درد لینا چاہتی تھی۔میں جانتی تھی کہ محرومیاں میرا مقدر ہیں۔مجھے اپنی زندگی ایک لق و دق اور چٹیل میدان نظر آتی تھی۔مجھے ان راہوں پر اکیلے چلنا تھا۔میری تمنا تھی کہ میں یادوں کے گھنے سائے ہمراہ لے لوں۔جب ماحول کی تمازت اور آگ مجھے جُھلسا ڈالے تو یادوں کی یہ ٹھنڈی چھاؤں چند لمحوں کے لئے میری جلن کو کم کر سکے۔''

یاسمین رو رہی تھی ،زرغونہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے۔ماحول سوگوار اور اداس تھا۔

کافی دیر گزر گئی۔گھڑی پر نگاہ ڈالی۔باتوں میں وقت کا خیال ہی نہ رہا تھا۔احسن کو کھانے کے لیے کچھ دینا تھا۔شوہر بھی ہسپتال سے آنے والے تھے۔

''زرغونہ مجھے اب اجازت دو !'' یاسمین نے اس کا ہاتھ محبت سے دبایا۔

''لیکن آپ مجھ سے ایک وعدہ کیجیے۔''اس نے یاسمین کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کیا؟''

''آپ میرے ،متعلق احسن سے کبھی کوئی بات نہیں کریں گی۔اور نہ کبھی یہ ظاہر کریں گی کہ آپ مجھ سے مل چکی ہیں۔''

''گھبراؤ نہیں زرغونہ تمہارا وقار مجھے عزیز ہے۔'' یاسمین نے پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔

''شکریہ !''

''میں تمہیں احسن کی صحت کے بارے میں گاہے گاہے اطلاع دیتی رہوں گی ۔ ویسے گھبرانا نہیں ۔خدا سے دعا کرنا ۔اب ان کی حالت کافی بہتر ہے، یہ میرا فون نمبر ہے۔اگر میں اطلاع نہ دے سکوں تو تم کر لینا ۔''

کار چلی تو یاسمین نے دیکھا۔زرغونہ آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں دانتوں کو کاٹ رہی تھی ۔

باب نمبر:۳۴

کمانداراابروؤں کے نیچے بوجھل پپوٹوں کے سائے میں ڈھکی آنکھیں غالباً فارمیکا کی میز کی چاکلیٹی لمبی لمبی لائنوں کو گھور رہی تھیں۔بایاں ہاتھ سر کو تھامے ہوئے تھا۔کہنی میز پر ٹکی ہوئی تھی۔خوبصورت لانبی انگلیاں سیاہ بالوں میں اُلجھی ہوئی تھیں۔

ایک طویل آہ بھرتے ہوئے اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔بلاشبہ یہ آنکھیں بہت حسین ہوں گی۔لیکن اس وقت بہت خوفناک نظر آرہی تھیں۔خطرناک منصوبے انگڑائیاں لے رہے تھے۔اور ایک ایسی چمک ان میں نظر آرہی تھی جو اپنے دشمن کو جلا کر بھسم کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

یہ ممتاز بائی تھی۔

کمر کو لچکاتے ہوئے وہ اٹھی تنی گردن اور اکڑے سینے سے چلتی ہوئی وہ برآمدے میں آ گئی۔دائیں طرف مڑی اور آسمانی پردوں والے کمرے میں داخل ہو گئی۔

''سرلا !کیسی طبیعت ہے تمہاری؟''

''اب تو بہتر ہوں۔'' اس نے چہرہ دبیز کمبل سے باہر نکالتے ہوئے کہا۔

''دودھ پیا ہے؟''

''کچھ طبیعت نہیں چاہتی۔''

''سرلا! تمہاری یہ عادت مجھے سخت ناپسند ہے۔ اپنا خیال نہیں رکھو گی تو مر جاؤ گی۔'' ممتاز بائی ناراضگی سے بولی۔

''کیا کروں؟ دودھ کو دیکھتی ہوں تو متلی ہونے لگتی ہے۔ ریشماں سے آج کہا ہے کہ اوولٹین ڈال کر دے۔

''سرلا!'' ممتاز بائی نے بوجھل آواز میں اسے پکارا۔

''میں تم سے کیا کہتی تھی کہ اس کے اطوار مشکوک ہیں لیکن تم نے ہمیشہ مجھے جھٹلایا۔ لو آج یہ راز بھی فاش ہو گیا۔ آخر ہفتوں بھر گھر سے یوں ہی غائب نہیں رہا جاتا تھا۔

''کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''صاحب زادی خیر سے مرض عشق میں مبتلا ہیں۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟'' سرلا بائی کمبل پرے پھینکتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

''کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی، یہ دیکھو!''

اس نے وہی چٹ اس کی طرف بڑھائی جو یاسمین نے دوسری مرتبہ زرغونہ کو بھیجی تھی۔

''احسن''

اس نے چٹ پڑھنے کے بعد سوالیہ نظروں سے ممتاز بائی کو دیکھا۔

''اس کا عاشق!'' حقارت سے اس نے کہا۔

''محض کاغذ کے اس پرزے کو دیکھ کر تم یہ اندازے لگا رہی ہو ممکن ہے سٹوڈیو

میں کسی جان پہچان والے کا نام ہو۔اور اس کی عزیزہ اس کا حوالہ دے کر ملنا چاہتی ہو۔

''تمہیں کب عقل آئے گی؟''اس نے دانت پیسے۔

''میں سارا کچا چٹھا سن کر آ رہی ہوں۔اور تم مجھے لیکچر دے رہی ہو۔''

''تمہاری مبہم باتوں کو میں میں سمجھنے سے رہی۔سیدھی طرح بتایا کرو۔''

سرلا نے کسی قدر ناراضگی سے کہا۔

ساری تفصیل جاننے کے بعد سرلا بائی کافی دیر خاموش رہی۔جھکی آنکھیں سرخ کمبل کو گھورتی رہیں۔

''ہوں تو گویا مستقبل میں یہ عزائم ہیں۔''اس نے پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے متفکرانہ انداز میں کہا۔

''حرام زادی۔۔۔میں دیکھوں گی ڈاکٹری پڑھتی کیسے ہے؟ رنڈی کی اولاد ہو کر پڑھنے چلی ہے۔لاج لگائے گی اس بازار کو۔''

ممتاز بائی کی آواز میں نفرت ہی نفرت تھی۔

''خیر یہ ابھی دور کی بات ہے،سوال یہ ہے وہ عورت جو درمیان میں آ گئی ہے کہیں وہ نہ کوئی کام کر جائے۔''

''اس کے لئے بھی میرے ذہن نے کچھ سوچ لیا ہے۔''

''کیا؟''

''تجویز کے سب پہلوؤں پر تفصیلی غور کرنے کے بعد اطمینان سے بتاؤں گی۔''

''ایسا نہ ہو تم سوچتی ہی رہو۔اور جو ہونا ہے وہ پہلے ہی ہو جائے۔''

''اطمینان رکھو لڑکا ابھی بیمار ہے۔اور بیماری بھی عشق کی ہے۔ٹھیک ہونے میں بھی کچھ وقت لگے گا۔''ممتاز بائی نے کہا۔

''ویسے ہماری یہ خوش قسمتی ہے۔وہ عام نوجوانوں سے بہت مختلف معلوم ہوتا ہے۔''

''اے کاش اگر یہ لڑکی راہ راست پر ہوتی تو کیا بات تھی؟سرلا ہم دولت کے سمندر میں نہاتے۔''

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔نفیسہ کی نتھ اتروائی کی رسم ہے۔شاداں آئی تھی۔''

''کب؟ میں کہاں تھی؟''ممتاز بائی تیزی سے پوچھا۔

''آج گیارہ بجے آئی تھی اور پندرہ کو رسم ہے۔''

''کس کو پھانسا ہے؟اس کلوٹی کے لئے؟''

وہ مل اونر مبارک احمد ہے نا اسی کا کہہ رہی تھی۔''سرلا بائی نے بتایا۔

''چلو اچھا ہوا جیسی روح ویسے فرشتے۔کیا بتاتی تھی سودا کتنے پر ہوا؟''

''دس ہزار کا کہہ رہی تھی۔''

''سور کی اولاد ! ڈینگیں مارتی ہے ہمارے سامنے۔ممتاز بائی تو تجھ جیسوں کو کھڑے کھڑے بیچ ڈالے۔کھٹا گوشت اور دس ہزار پر۔کیا کہنے ہیں شاداں بائی تیرے۔''اس نے ناک سکوڑتے ہوئے نخوت سے کہا۔

''تم نے کچھ کہا نہیں؟''اس نے سرلا سے پوچھا۔

''کیا ضرورت تھی میں تو چپکی بیٹھی سنتی رہی۔''

''ضرورت کیوں نہیں؟اپنی اوقات بھول گئی ہے جو ہمارے پاس آ کر لن ترانیاں کرتی ہے۔معاہدہ کتنے عرصے کے لیے ہوا؟''

''ایک ماہ کا کہہ رہی تھی۔''

''وہ مل اونر مبارک اور ایک ماہ۔جسے ہر رات ایک نئی عورت چاہیے۔سمجھ میں نہیں

آ نا حرام زادی خود کو کیا سمجھنے لگی ہے؟''

''کیا چلنے کا ارادہ نہیں ؟''

''کیوں نہیں ضرور چلیں گے۔''۔۔اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ممتاز نواز علی نے روپیہ ادا کر دیا ہے۔''

''چالیس ہزار آج لے کر آئی ہوں ۔بقیہ ادائیگی کا بارہ کو کہہ رہا تھا۔''

''سر لا زرغونہ کو پاک رب ہدایت دے۔فلم ساز غلام قادر منتیں کر رہا تھا کہ ایک فلم میں ہی کام کر دے۔''

''بال نچوانے ہیں کیا مجھے؟تمہیں تو خیر خاطر میں ہی نہیں لاتی جو تھوڑا بہت میرا لحاظ کرتی ہے تم اسے بھی ختم کروانے کے در پے ہو۔غنیمت جانو وہ نواز علی کی فلموں میں ہی کام کر رہی ہے۔

اس نے کمبل خود پر ڈالتے ہوئے کہا۔

باب نمبر:۳۵

کار کے وزنی پہیوں کے نیچے سرخ رنگ کی بجری چرچرا رہی تھی۔آہستہ آہستہ چلتی کار برساتی کے نیچے پہنچ کر خفیف سے جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔اور وہ ساڑھی سنبھالتی باہر نکل آئی۔اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا رہی تھیں۔اور اس دھندلاہٹ میں اسے اپنے گھر کا طویل برآمدہ اور کمروں کے دروازے ڈوبتے نظر آ رہے تھے۔بوجھل قدموں سے اس نے برآمدے کی سیڑھیاں طے کیں اور شفاف شیشوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے ایک کمرے کے اندر جھانکا۔احسن سو رہے تھے۔ان کے چہرے سے اضطراب جھلک رہا تھا۔ان کی نیند پرسکون نہ تھی۔اور اسی لمحے ڈب ڈب کرتی آنکھیں برس پڑیں۔

کڑے اور پتھریلے راستوں پر چلنے والے عظیم انسانو ! تم دونوں ہی مافوق البشر ہو۔اس کی آنکھوں کے سامنے صدیوں کی تاریخ سیاہ حروف میں سفید کاغذوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ان کاغذوں سے ماضی کے زندہ جاوید کردار اس کے سامنے ابھر رہے تھے۔وہ کردار جو آتما کی شانتی کے لئے زندگی کی آسائشوں سے کنارہ کشی کر گئے تھے۔

''اور تم بھی ایسے ہی کردار ہو جنہیں اپنا ماحول سکون نہ دے سکا۔ اپنے ماحول سے بغاوت کرنے والے اے میرے پیارو تم لوگ ! غلط فہمیوں کی آندھیوں میں خزاں کے زرد پتوں کی طرح اپنی شاخ سے ٹوٹ کر بکھر گئے ہو۔ میں تمہیں یک جا کرنے کی ہر امکانی کوشش کروں گی۔''

آرزدہ لہجے میں بڑبڑاتی ہوئی وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پورے دو گھنٹے تک وہ سوچ و بچار کے گہرے سمندر میں غوطہ زن رہی۔ سوچتی رہی غور کرتی رہی لیکن کسی حتمی فیصلے پر نہ پہنچ سکی۔

پانچ بج رہے تھے۔ وہ اٹھی احسن کے کمرے میں گئی۔ وہ بیدار ہو چکے تھے۔ ان کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ اس وقت انہیں پھلوں کا جوس دینا تھا۔ باورچی خانے میں گئی۔ خانساماں نوکر کے ہاتھ پہلے ہی بھیج چکا تھا۔

نعیم ہسپتال سے آیا تو اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

''نعیم ! میں زرغونہ سے ملی ہوں۔''

''کب ؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے یاسمین کی طرف دیکھا۔

''آج دو بجے میں اس کے ہاں گئی تھی۔''

اور زرغونہ سے سنی ہوئی داستان کا ایک ایک لفظ اس نے شوہر کو سنا دیا۔

''سمجھ نہیں آتا احسن کو کیونکر یقین دلایا جائے۔'' یاسمین مضطرب لہجے میں بولی۔

''گھبراؤ نہیں۔ صادق جذبات براہ راست دل سے تعلق رکھتے ہیں وہ ایک نہ ایک دن ضرور اعتراف کرے گا۔ دراصل اس کا بھی قصور نہیں، محبت اندھی اور جلد بدگمان ہونے والی شے ہے۔'' نعیم نے اس کی دل دہی کی۔

''آپ کو تو یقین ہے نا ؟'' اس نے مسکراتے ہوئے شوہر کی طرف دیکھا۔

''نہ یقین کرنے والی کوئی بات نہیں، یہ قدرت کے اعجاز ہیں جن پر ایمان ایک مسلمان کا فرض ہے۔''

رات کے سات بجے فون کی گھنٹی بجی، نعیم نے ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو !''اس نے کہا۔

''مسز یاسمین نعیم کیا گھر پر ہیں؟''پوچھا گیا۔

''جی ہاں آپ ہولڈ کیجئے میں بلائے دیتا ہوں۔''

یاسمین نے ریسیور کان سے لگایا۔زرغونہ بول رہی تھی وہ احسن کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

''زرغونہ احسن کو تمہارے جیسی مقدس اور پاکیزہ ہستی کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔گھبراؤ نہیں بس دعا کئے جاؤ۔''

''کاش میری دعاؤں میں اتنی تاثیر ہوتی۔''اس نے حسرت سے کہا۔

''زرغونہ ! مایوسی گناہ ہے۔''

''اچھا خدا حافظ کہتے میں کل پھر فون کروں گی۔''

خدا حافظ کرتے ہوئے یاسمین نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

کافی غور و خوض کے بعد بھی کوئی قابل عمل تجویز نظر نہیں آ رہی تھی یوں تو بے شمار تجاویز ذہن میں کلبلا رہی تھیں۔

لیکن جونہی ذہن کے خانے سے نکل کر عمل کی کسوٹی پر پرکھتی اس کا بھدا پن بری طرح ظاہر ہونے لگتا۔نعیم نے اس کے اضطراب کو محسوس کیا تو بولا۔

''روشنی سے کیوں نہیں مشورہ کرتیں؟''

روشنی رشتے میں یاسمین کی ماموں زاد بہن تھی۔حد درجہ نٹ کھٹ لڑکی تھی۔نعیم

کے چھوٹے بھائی طاہر کو بہت پسند کرتی تھی ۔اور برملا اعتراف کرتی تھی ۔نعیم بھی چاہتے تھے،وہ بھائی کی بیوی بن کر گھر میں آجائے ۔لیکن کچھ خاندانی اختلافات بھی درمیان میں حائل تھے ۔میاں بیوی اپنی سی کوشش کر رہے تھے ۔اور بدلتے ہوئے حالات سے خاصے پر امید تھے ۔

''واقعی میں بھی کتنی پاگل ہوں ۔اس کا ذہن تو ایسی باتوں میں خوب لمبی لمبی چھلانگیں لگاتا ہے ۔''

اسی وقت اس نے فون کا ڈائل مختلف نمبروں پر گھمایا ۔

''اسلام علیکم !'' وہ فون پر کبھی ہیلو نہیں کہتی تھی ۔

''اوہو یاسمین بیٹے خیریت سے ہونا !''دوسری طرف سے ایک معمر آواز سنائی دی ۔''

''جی ہاں ۔خدا کا شکر ہے ماموں میاں ۔آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''اس نے استفسار کیا ۔

''سردیوں کو۔۔۔۔بڑھاپا کم ہی پسند کرتا ہے ۔''انہوں نے ہنستے ہوئے شگفتگی سے کہا اور پھر فوراً ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے ۔

''ہاں یاسمین احسن کا کیا حال ہے؟''

''پہلے سے بہتر ہیں ۔''

''بھئی مجھے معاف کرنا یاسمین !روز آنے کا قصد کرتا ہوں لیکن آنہیں پاتا ۔اس سردی سے جان جاتی ہے ۔''

''ماموں میاں ذرا روشنی کو بلا یئے گا ۔''

''ہیلو !فرمایئے بیگم یاسمین نعیم ۔''

''بھئی روشنی اسی وقت گھر آؤ۔ضروری کام ہے۔''

''کیا کام ہے۔تفصیل تو بتاؤ۔ممکن ہے آلات وغیرہ لانے کی ضرورت ہو۔''

''تم اور آلات کی بات کرو۔کیا اپنے وجود پر اعتماد نہیں رہا۔''یاسمین نے لطیف سی چوٹ کی۔

''تمہارے گھر آتے وقت خود پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔''

''زیادہ بڑ بڑ مت کرو۔جلدی آؤ!''

اور پھر سارا معاملہ اس کے سامنے رکھا گیا۔فلموں کی شیدائی وہ بھی تھی۔سبینہ کے متعلق سنتے ہی اچھل پڑی۔دیدے شوخی سے گھماتے ہوئے مسکرائی۔

''ہوں تو یہ کہو دلالی کے لئے بلایا گیا ہے۔ہاں تو بولو ہمارا کمیشن کتنا؟''

''تیرا ستیاناس جائے۔''یاسمین نے اس کی کمر پر ایک دوہتڑ جمایا۔کمبخت نیکی کا کام ہے ثواب ہوگا۔''

''یہ نیکی اور ثواب مجھے نہیں چاہئیں۔پہلے ہی نہیں سنبھالے جارہے ہیں تو معاملے کی بات کر۔''اس نے ہاتھ ہوا میں نچایا۔

''کس معاملے کی؟''یاسمین خصوصی سنجیدہ سے بولی۔

''قربان جاؤں تیری معصومیت کے۔''اس کی ٹھوڑی کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے چھوتے ہوئے اس نے ایک ادا سے کہا۔

''بول کیا چاہتی ہے؟''یاسمین نے گردن اکڑاتے اور شاہانہ انداز اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے کہا۔

''بس بس ہرمیجسٹی کی فیاضی خدانخواستہ جوش میں آگئی تو لینے کے دینے پڑجائیں گے۔''

''اللہ !''یاسمین نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

''سر دھڑ کی بازی لگا رہی ہوں اور بیگم صاحبہ کو کوئی احساس ہی نہیں ۔ارے میں کیا کم فکرمند ہوں ۔''

''جی !''اس نے طنزیہ ہنکارہ بھرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''میری سمجھ سے تو یہ بالاتر ہے کہ تم فکر کس وقت کرتی ہو؟ ذرا مجھے بھی تو بتاؤ۔''

''بیگم صاحبہ !سارا وقت تو میاں کی بغل میں گھسی بتیس دانت نکالے پھرتی ہے اور اوپر سے دعوی کرتی ہیں فکرمندی کا۔''

''تمہیں اعتراض ہے میرے پھرنے کا؟''

''بالکل !۔۔۔آپ ہم سے چار مہینے پانچ دن اور سات گھنٹے چھوٹی ہیں ۔شرم تو نہ آئی آپ کو ہاتھوں میں مہندی رچاتے ہوئے ۔کچھ تو ہمارا خیال کیا ہوتا کہ ساتھ ایک ازلی دم چھلا بھی لگا ہوا ہے ۔اس کا بھی کہیں بندوبست کر دیں۔''

''ہماری مرضی !''

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو ۔اب مجھے سنجیدگی سے اس قصے کے متعلق بتلاؤ۔میں بہت پریشان ہوں ۔''

''بتاؤں کیا کوڑھ مغز ؟ کہہ تو دیا ہے لڑکے نے بڑھ کر خود نہ لڑکی کا ہاتھ تھاما تو روشنی نام نہیں۔''

''اللہ !روشنی یوں گول مول بات نہ کرو کچھ مجھے بھی بتاؤ؟''

گول مول بات میں ہی مزا ہے ۔اور رہا تجھے بتانے کا سوال تو تجھے پتہ لگ ہی جائے گا۔میں اب چلی ''۔۔۔اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''روشنی !''

''بھئی یاسمین میں قطعی سنجیدہ ہوں۔گھبراؤ نہیں۔''

''ہاں تو پھر تیرا دیور خیر خیریت کے ساتھ کب آ رہا ہے۔فرانس سے؟''

اس نے چلتے چلتے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''شادی کی تیاری کر۔''

''ذرا اپنی ساس سے بھی پوچھ لیا ہوتا۔سنا ہے لوگوں کو کہتی پھرتی ہیں کہ ایک نے ہی دن میں تارے دکھا دیئے ہیں، دوسری کو لے کر چاند سورج نہیں دیکھنا مجھے۔''

''کس سے کہہ رہی تھیں؟'' یاسمین کا رنگ اڑ گیا تھا۔اڑنا بجا تھا۔ساس سے اس کے مراسم بہت اچھے تھے۔

''یہ میں نہیں جانتی۔بس اڑتی اڑتی خبر ہم نے بھی سنی ہے۔''

''سچ کہتی ہو؟''۔۔۔یاسمین بہت پریشان نظر آ رہی تھی۔روشنی کو رحم آ گیا۔

''ارے نہیں بابا، مذاق کو تو سمجھا کر۔تجھ جیسی پیاری لڑکی سے کسی کی ناراضگی ہو سکتی ہے بھلا؟''

''اللہ تم نے تو مجھے دہلا ہی دیا تھا۔''

''اچھا خدا حافظ !عدنان کو پیار دینا اور اپنے صاحب کو سلام۔اس نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''خدا حافظ !یاسمین نے ہاتھ ہلایا۔

باب نمبر:۳۶

جگمگاتی روشنیوں میں تیکھے، موٹے موٹے اور گوار انقوش والے سانولے سلونے سنہری، گندمی اور سرخ وسفید رنگت والے چہرے غازے کی تہوں میں لپٹے لپٹائے ،جدید ملبوسات میں جکڑے جکڑائے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ہاتھوں میں کھانے کی پلیٹیں اور لبوں پر مسکراہٹوں کی کلیاں سجائے جوڑے ادھر ادھر کھڑے تھے۔

یہ کاشانہ عدنان کے کھانے کا کمرہ تھا۔تقریب کے مہمان خصوصی احسن رضا تھے۔جس کے غسل صحت کی خوشی میں یہ ضافت یاسمین نعیم نے دی تھی۔مہمانوں میں یاسمین کی سہیلیاں، احسن اور نعیم کے دوست اور چند معزز مہمان مدعو تھے۔

احسن اب پہلے سے بہتر تھے۔فطرتاً وہ سنجیدہ مزاج تھے۔ہر چند کہ ان کی سنجیدگی اور بھی گہری ہوگئی تھی۔اب ہونٹوں پر خاموشی اور چپ ہمہ وقت مسلط رہتی۔

''احسن !اب شادی کرڈالو۔''ان کے ایک بے تکلف دوست نے کہا۔

''بھابی آپ کس مرض کی دوا ہیں؟احسن کے گھر بسانے کا بندوبست کیوں نہیں کرتیں؟''فاروق نے یاسمین کو مخاطب کیا۔

''بھئی نیا زمانہ ہے۔زبردستی کرنے سے رہی ۔آپ بھی کوشش کیجئے نا۔مانتے ہیں تو دو گھنٹوں میں حسین ترین لڑکی یہاں لا کر کھڑی کیے دیتی ہوں۔''

''یاسمین بھابی مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے؟''ڈاکٹر نازلی نے دور سے آواز دی۔

''کیا؟''منہ میں رکھے کباب کو جلدی جلدی کھاتے ہوئے اس نے کہا۔

''بہت کنجوس ہیں آپ !''فضا سب کے قہقہوں سے گونج اٹھی۔

''کیوں بھئی کیا شکایت ہے تمہیں؟ کیا بات دیکھی کنجوسی کی؟''یاسمین کمال اطمینان سے بولی۔۔۔سمجھ گئی تھی ڈاکٹر نازلی کے پاس نعیم کھڑے تھے۔اُبھارا جا رہا تھا۔

''عدنان کی پارٹی گول کر گئی ہیں نا؟ مٹھائی کے ایک ایک ڈبے پر ٹرخا دیا۔

''ہیئر ہیئر۔''فاروق نے تالی بجائی۔

''کیا لاجواب بات کی ڈاکٹر نازلی آپ نے۔''فاروق نے گرہ لگائی۔

''کیوں بھابھی !نعیم کی فضول خرچی اور اپنی کنجوسی جمع کر کے میزان برابر رکھنا چاہتی ہیں نا؟''

''آپ لوگ تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئے ہیں۔بھئی وہ حالات ہی ایسے تھے۔اماں بیمار تھیں۔پارٹی کیسے دیتی؟ آپ کچھ کہتے کیوں نہیں؟''اس نے مصنوعی خفگی سے شوہر کی طرف دیکھا۔''

''مجھ پر یہ عتاب کیوں بھئی؟''اس کی آڑی ترچھی نظریں نعیم نے خود پر محسوس کرتے ہوئے کہا۔اور پھر اطمینان سے بولا۔

''تم سے پوچھتے ہیں تم ہی جواب دو۔''

''کیوں روشنی کیا واقعی خالہ جان بیمار تھیں؟''فاروق نے روشنی سے پوچھا۔

''بہانے خور ہے سدا کی۔''اس نے شہہ دی۔

''روشنی جھوٹ کیوں بولتی ہو؟ کیا اماں بیمار نہیں تھیں۔''

''کتنے دن بیمار رہیں؟ بیگم یاسمین نعیم؟''اس نے ناچتی آنکھوں سے اسے گھورا۔

''یہ ہماری حق تلفی ہوئی ہے۔اور ہم اس کے خلاف پرزور احتجاج کرتے ہیں۔''ڈاکٹر نازلی ہنوز مسکرا رہی تھی۔

''ڈاکٹر فاروق ہر جانے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیجئے؟''ڈاکٹر سمیع نے کہا۔

''اور آپ اپنے خیال سے ذرا آگاہ کیجئے۔''یاسمین نے ڈاکٹر نازلی سے کہا۔

''میں ڈاکٹر فاروق کی رائے سے مکمل اتفاق کرتی ہوں۔''

اور اگلے مہینے دعوت کا وعدہ دے کر یاسمین نے اپنی جان چھڑائی۔

''احسن چپ کیوں ہو؟ کچھ بولو نا۔''عمران نے انہیں گم صم دیکھ کر کہا۔

''ضرورت نہیں سمجھی،تم کمی پوری کر تو رہے تھے۔''انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہی سب ڈرائنگ روم میں آ گئے۔چائے اور کافی کا دور چلنے لگا۔

احسن دریچے کے پاس صوفے پر بیٹھے تھے۔ان کے بالکل قریب روشنی اور اس کی سہیلیاں تھیں۔معصومہ نے فلمی اخبار اٹھایا اور پڑھنے لگی۔

''یہ کیا بیہودہ پن ہے؟محفل میں بیٹھ کر پڑھنا آداب محفل کے خلاف ہے۔''روشنی نے قدرے غصے سے کہا۔

''لیکن معصومہ نے نظر اٹھا کر دیکھنے تک کی زحمت گوارا نہ کی۔اطمینان سے سر

جھکائے پڑھتی رہی۔

معصومہ سوسائٹی کے ایٹی کیٹس کا خیال کرو۔اخبار رکھ دو اور ہمارے ساتھ باتیں کرو۔''

بھاڑ میں ڈالو ایٹی کیٹس کو۔تمہیں کیا معلوم میں کتنی اہم خبر پڑھ رہی ہوں۔حیرت ہے یہ میری نظر سے کیوں نہیں گزری۔''

''کیا؟''روشنی نے گہرے تجسس سے پوچھا۔

''بتاتی ہوں'' کہتے ہوئے وہ دوبارہ اخبار پر جھک گئی۔

''واہ واہ اترانے لگی ہیں بیگم صاحبہ !''

روشنی نے ناک سکیڑی اور جھپٹ کر اخبار اس کے ہاتھوں سے چھین لیا۔

''بہت بدتمیز ہو۔تمہارے ایٹی کیٹس ایسا کرنے کی اجازت دیتے ہیں؟''

''سب چلتا ہے پیاری۔''روشنی نے اطمینان سے کہا۔

''اوہو ہو؟اس نے آواز لگائی۔

''مائی سویٹ ہارٹ سبینہ !''اس نے اخبار زانوؤں پر پھیلاتے ہوئے اپنے بازو اس پر پھیلا دیئے تاکہ کوئی چھین نہ سکے۔

لیکن سبینہ کا نام ہی کافی تھا۔سب لڑکیاں اپنی اپنی جگہ سے اٹھیں اور اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑی ہو گئیں۔

اور سبینہ نام سنتے ہی احسن کا رنگ فق ہو گیا۔

''بھئی یہ کیا۔جمگھٹا یہاں کیوں لگ گیا ہے؟''علی غصے سے چلایا۔

''سبینہ زندہ باد!''روشنی نے غصے سے لال پیلے ہوتے علی کا منہ چڑایا۔

''کیا خبر ہے روشنی!عمران نے اشتیاق سے پوچھا۔

''وہ اس سال میٹرک کا امتحان دے رہی ہے مستقبل قریب میں اس پیشے کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر ڈاکٹری میں جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔

روشنی نے مزے لے لے کر تحریر کا خلاصہ سب کو با آواز بلند سنایا۔

''خدا نہ کرے وہ ڈاکٹر بنے ورنہ اتنا معزز پیشہ بدنام ہو جائے گا۔'' عمران کے لہجے میں تلخی تھی۔

''کیوں؟''۔۔۔فاروق نے فوراً سوال کیا۔

''بھئی صورت دیکھ کر تو مریض اپنی بیماری بھول جائیں گے۔لیکن بات کرنے کے بعد قدرت کو کوسیں گے کہ اتنا حسن کس بد دماغ پر لٹا دیا ہے۔''

''سبھی ڈاکٹر تو اخلاق میں یکتا نہیں ہوتے سینکڑوں ایسی مثالیں ہیں جن کے ڈاکٹر ہونے پر افسوس ہوتا ہے۔'' یاسمین بولی۔

''لیکن میں نہیں مانتی وہ مغرور ہوگی۔'' عزیزہ نے خاصی بے چینی سے کہا۔

''بھئی تمہارے ماننے نہ ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ حقیقت ہے جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔وہ تو چلتی اتنے تکبر سے ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے۔جیسے ساری دنیا اسے جھک کر سلام کر رہی ہو۔''

عمران کی اس بات پر کونے میں بیٹھے سر سلیمان کھلکھلا کر ہنسے۔سر سلیمان کا تعلق فلم انڈسٹری سے تھا۔اور روشنی کے حقیقی ماموں تھے۔

''بہت جلے بھنے لگتے ہو عمران ! ملاقات ہوئی ہے کیا اس سے؟'' انہوں نے اطمینان سے دریافت کیا۔

''بہت اشتیاق تھا اسے دیکھنے کا۔میں، لونا اور بینو تینوں اس کے دیدار کے لئے گئے۔اتنا دکھ ہوا۔لیکن یہ سوچ کر کہ نالی کی اینٹ چوبارے لگ جائے تو یہی نتیجہ ہوتا

ہے۔دل کو تسلی دی تھی۔''

''اس کا تعلق اس بازار سے ہے۔''بیگم فاروق نے اپنی معلومات جتائیں۔

گفتگو بہت نازک موڑ اختیار کرتی جا رہی تھی۔روشنی کو ماموں پر سخت غصہ آ رہا تھا۔کچھ کہنے کی بجائے اطمینان سے تبصرے سن رہے تھے۔

یاسمین نے چور نظروں سے احسن کو دیکھا۔معلوم ہوتا تھا کہ ان کے چہرے کا خون اور آنکھوں کی روشنی کسی نے بے دردی سے چھین لی ہے۔اس نے روشنی کو گھورا وہ غصیلی نظروں سے سر سلیمان کو گھور رہی تھی۔

''ڈاکٹر عمران !انہوں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں، وہ بہت عظیم لڑکی ہے۔اس کی عظمت تک تم لوگوں کے ذہنوں کی رسائی نہیں۔کوئلوں کی کان میں رہتے ہوئے بھی اس کے دامن پر سیاہی تو درکنار ہلکی سی دھندلاہٹ بھی نہیں۔دامن بالکل اجلا ہے۔''

اس کے متعلق سر سلیمان نے ایک ایک بات بتائی کہ وہ کس کی بیٹی ہے، کہاں سے آئی ہے، اور اسے کون لایا ہے۔

''خدا کی شان ہے۔''یاسمین بے اختیار رو لی۔

''اس میں کوئی شک نہیں۔''سر سلیمان نے یاسمین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ویسے اس کی بد دماغی کے کافی چرچے ہیں۔پچھلے دنوں سننے میں آیا تھا، اس نے ایک پریس کانفرنس میں صحافیوں کی خوب خاطر کی تھی۔''کسی نے غصہ سے کہا۔

حالات کے تھپڑوں نے اُسے ایسا بنا دیا ہے۔فطرتاً وہ ایسی نہیں۔میں آپ کو سٹوڈیو کی بات بتاتا ہوں سب لوگ اس کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ہدایت کار تک کی کیا مجال کہ اسے کچھ کہہ جائے۔حقیقتاً وہ اپنے گرد ایک ایسا خول چڑھا لینا چاہتی ہے کہ

اسے کوئی نہ دیکھ سکے۔لیکن وہ حالات کے تحت اپنی نمائش کرنے پر مجبور ہے۔''

''اسے کسی اچھے آدمی کے ساتھ شادی کرلینی چاہئے۔''فاروق نے نے تجویز پیش کی۔

''انکل اگر وہ میرے ساتھ شادی کرنے پر رضا مند ہو جائے تو میں تیار ہوں۔''عمران نے فوراً خود کو پیش کردیا۔

بے اختیار سب ہنس پڑے۔

''کوشش کر دیکھو۔ممکن ہے کامیاب ہو ہی جاؤ۔''

''اچھا بھئی اب مجھے اجازت دیں۔کافی وقت ہو گیا ہے۔''انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

محفل میں وہی ایک بزرگ تھے،سب کھڑے ہو گئے۔

''چچا میاں ! ہم شکر گزار ہیں کہ آپ نے اپنی بے پناہ مصروفیات سے ہمارے لئے وقت نکالا۔''یاسمین احسان مندی کے جذبات سے مغلوب تھی۔

''ارے بس بس بیٹے !''

وہ احسن کی طرف گئے۔ان کے شانے تھپتھپائے اور محبت سے بولے۔

''کبھی میرے گھر کا بھی چکر لگاؤ نا صاحبزادے!''

''پہاڑوں سے فرصت ملے تو کہیں جائیں''فاروق نے ہلکے سے طنز کیا۔

''یہی انسانی عظمت ہے۔حقیقت ہے میں اس نوجوان سے بہت متاثر ہوں۔''انہوں نے فاروق سے کہا۔

خدا حافظ کہتے ہوئے وہ باہر آ گئے۔یاسمین نعیم اور روشنی بھی ان کا تعاقب میں باہر نکلے۔

’’مزید باتوں کی اب ضرورت نہیں۔موضوع بدل دینا۔مجھے امید ہے کہ غبار ڈھل گیا ہوگا۔وگرنہ تنہائی میں ڈھل جائے گا۔‘‘

انہوں نے یاسمین کو ہدایت کی۔

’’بہت بہتر !اس نے کہا۔

’’روشنی !تم رات کو یہیں ٹھہرو گی؟‘‘انہوں نے بھانجی سے پوچھا۔

’’جی ہاں ماموں میاں !‘‘

ان کے جانے کے بعد تینوں کمرے میں آ گئے۔

باب نمبر: ۳۷

''اپنی زندگی سے کبھی کسی نے ناٹک نہیں کھیلا احسن !'' کپکپاتے ہونٹوں سے یہ صدا ابھری۔

''آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ؟''حیرت و خوف سے لبریز آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا رہی تھیں۔

''آپ کی دنیا کے شریف زادے اور شریف زادیاں بھلا میں انہیں کہیں جانتی ہوں؟''غم و غضب سے کانپتا لرزتا وجود خود کو بدقت سنبھالے دروازے کا سہارا لئے کھڑا تھا۔

''پارسائی کیا آپ کی خاندانی میراث ہے؟''آنکھوں نے قہر کی بجلیاں گرائیں۔

یہ زرغونہ کے متعدد روپ تھے، جوان کی آنکھوں کے سامنے ایک کے بعد ایک نمودار ہو رہے تھے۔

انہوں نے دانت بھینچ لئے۔ جبڑے ابھر آئے۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور چہرہ

گہرے اضطراب کو ظاہر کرنے لگا۔ بے بس ہو کر انہوں نے کروٹ بدلی۔لیکن بے چینی کم نہ ہوئی۔مضطرب ہو کر اٹھ بیٹھے،اور کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگے۔

''وہ بہت عظیم ہے۔اس کی عظمت تک تم لوگوں کے ذہنوں کی رسائی نہیں۔کوئلوں کی کان میں رہتے ہوئے بھی اس کے دامن پر سیاہی تو درکنار ہلکی سی دھندلاہٹ بھی نہیں۔دامن بالکل اجلا ہے۔''

انہوں نے اپنے ہونٹ کاٹ لئے۔چہرے پر نقاہت اور آنکھوں میں بے بسی دونوں صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔

نامی گرامی اداکارہ کے پرستاروں میں جب اس کے متعلق بحث ہونے لگی تو احسن کو اپنا دل کٹتا ہوا محسوس ہوا وہ کیسی بھی تھی؟ اس سے انہوں نے پیار کیا تھا۔اسے چاہا تھا۔اس کے حصول کو بھی انہوں نے اپنی حیات کا منتہائے مقصود سمجھا تھا۔اس کی رفاقت کبھی ان کے لئے مقدر کا ایک حسین تحفہ تھی۔اس کے دیئے ہوئے زخموں نے انہیں اس حالت تک پہنچایا تھا۔

کیسے نہ گھٹن محسوس ہوتی،کیسے نہ وہاں سے بھاگ جانے کو جی چاہتا۔وہ ایک غیور مرد تھے کبھی یہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے کہ سر عام محفلوں میں یوں اس کے تذکرے ہوں۔یوں ہر خاص و عام اس پر رائے زنی کرے۔لیکن مجبور تھے کر بھی کیا سکتے تھے۔وہ پیسہ دے کر دیکھنے والی چیز تھی۔اور ہر انسان اس کے متعلق رائے کا حق رکھتا تھا۔یہ تو پھر بھی مہذب لوگوں کی محفل تھی جہاں گفتگو کرتے وقت تہذیب کا دامن مضبوطی سے تھاما جاتا ہے۔ورنہ وہ کیا نہیں جانتے۔

''سالی قیامت ہے۔ہوش و حواس ہی اڑا دیتی ہے۔'' یہ بازاری قسم کے فقرے ان کے کانوں میں ہمیشہ گونجتے اور خون کو کھولا کر رکھ دیتے۔وہ ایک عام چیز تھی جس تک کسی

کا ہاتھ نہیں گیا تو اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے اور رنگ برنگی تصاویر جمع کرنے پر ہی اکتفا ہوا۔

لیکن اس کے مداحوں کے بے لاگ تبصرے اس کے کردار پر سے پردہ اٹھا رہے تھے۔ سر سلیمان کو احسن بخوبی جانتے تھے۔ اصول پرست اور کھرے آدمی تھے۔ کبھی لگی لپٹی بات انہوں نے نہیں کی۔ وہ کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ماضی کا ایک ایک منظر کھلی آنکھوں کے ساتھ سامنے آ رہا تھا۔

''احسن آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ کبھی میری وفا پر شک نہ کریں گے۔''

وہ رک گئے یوں لگا جیسے زمین نے پاؤں پکڑ لئے ہوں۔ کوئی سسک رہا تھا۔

'' کائناتی نظام درہم برہم ہو جائے۔ رات دن میں بدل جائے آفتاب طلوع ہونا چھوڑ دے۔ کتنے ہی نامساعد حالات کیوں نہ ہوں۔ احسن آپ میری وفا پر کبھی شک نہ کریں گے۔''

بھٹکا ہوا ذہن صحیح راستہ پا رہا تھا۔ اور رات کی بارش آہستہ آہستہ اس سیاہی کو دھو رہی تھی۔ جسے ان کی غلط فہمی نے زرغونہ کے چہرے پر تھوپ دیا تھا۔

''لیکن اسے مجھ سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس نے خود کو ظاہر کیوں نہیں کیا؟ کیا میں اس کی باتوں پر یقین نہ کرتا۔ اتنے قریب آ کر بھی اسے میرے خلوص پر شک تھا۔'' انہوں نے بے اختیار سوچا۔

رات کے تین بجے وہ سونے کے لئے لیٹے تو خود کو کافی ہلکا محسوس کر رہے تھے سوچ چکے تھے کہ کل یہاں سے جانے کے بعد آ کا کو بلوا کر انہیں اسے لینے کے لیے بھیجیں گے۔

اپنے طرز سلوک پر انہیں کچھ اتنا تاسف نہ تھا۔ خود کو ہرگز مقصور وار نہیں سمجھ رہے

تھے۔ایک غیرت مند انسان کی حیثیت سے وہ اپنے ردِّعمل کو فطری سمجھتے تھے۔وہ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والوں میں سے نہ تھے۔ان کا اپنا ذہن تھا۔اپنے خیالات تھے۔اپنے مخصوص نظریات تھے۔

آٹھ بجے صبح نعیم ان کے کمرے میں آیا۔وہ پرسکون نیند سو رہے تھے۔

''کیسے ہیں؟''یاسمین نے شوہر کو آتے دیکھ کر فوراً پوچھا۔

''چہرے پر اطمینان معلوم ہوتا ہے۔''

''تیرا شکر ہے معبود !''

یاسمین !میری خواہش ہے وہ ہمارے پاس چند دن اور ٹھہریں۔وہ آج جانے کے لئے اصرار کرے گا۔لیکن اسے روکنے کی کوشش کرنا ممکن ہے تمہارا کہنا مان لے۔''نعیم نے ٹوسٹ پر جیلی لگاتے ہوئے کہا۔

''میں اپنی سی کوشش کروں گی لیکن امید کم ہے۔گزشتہ تین دنوں سے وہ جانے کے لئے مصر ہیں۔دعوت کی آڑ لے کر ٹھہرنے پر زور دیتی رہی تھی۔''

''ہاں مجھے یاد آیا مسز ظہیر تمہارا پوچھ رہی تھیں۔وہ شاید کلب کی ممبر بننا چاہتی ہیں۔''

''تو انہیں روکا کس نے ہے شوق سے بنیں ممبر۔''

ساڑھے آٹھ بجے نعیم ہسپتال چلا گیا۔یاسمین کو احسن کے بیدار ہونے کا انتظار تھا۔دس بجے وہ ناشتے کے لئے آئے تو ان کے چہرے پر قدرے شگفتگی تھی۔

''خوب سوئے ہیں آج تو ،میرا خیال ہے نماز بھی شاید ادا نہیں کی۔''یاسمین نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''نماز پڑھنے کے بعد پھر سو گیا تھا۔''۔۔۔ان کے چہرے پر آسودہ سی

مسکراہٹ تھی ۔یاسمین کو یہ مسکراہٹ دیکھ کر قلبی سکون محسوس ہو رہا تھا۔

''آج میں جانا چاہتا ہوں۔''

''نہیں نہیں،احسن بھیا! آپ کچھ روز اور رکنا پڑے گا۔''

''جانے دو یاسمین !میں بلائے جان نہیں بننا چاہتا۔''وہ مذاق سے ہنسے۔

''اللہ احسن بھیا ! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟''اس نے ناراضگی سے کہا۔

''بھئی یہ حقیقت ہے،وہ سنا نہیں ایک دن مہمان دو دن مہمان ،تیسرے دن بلائے جان ۔کہو تو جھوٹ ہے؟''انہوں نے اس کا غصہ دور کرنے کی کوشش کی۔

''اچھا چھوڑیئے ان باتوں کو،دیکھئے احسن بھیا آپ کو اب شادی کر لینی چاہیے ۔کبھی مجھے الزام دے رہے ہیں۔''

''سوچیں گے۔''احسن اطمینان سے بولے۔

''سوچنا کیا ہے؟میں لڑکی تلاش کرتی ہوں۔''

''فی الحال نہیں۔''

''کیوں؟''۔۔یاسمین الجھ رہی تھی۔

''مطمئن رہو یاسمین میری شادی جب بھی ہوگی تم ہی کروگی۔اچھا عدنان کہاں ہے؟''انہوں نے پوچھا۔

یاسمین نے نوکر کو بچے عدنان لانے کے لئے آواز دی۔

چھ مہینے کا صحت مند بچہ احسن کے پاس آ کر اچھلنے کودنے لگا۔

گرمیوں میں پراٹ کا چکر لگاؤنا''انہوں نے عدنان کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھیا جب تک وہاں کوئی استقبال کرنے والی نہ ہوگی میں آنے سے

رہی ۔''

''والی نہ ہوگی والا تو ہوگا۔کیا فرق پڑتا ہے۔''۔۔۔۔۔احسن مسکرائے۔

انہوں نے کلائی پر نگاہ ڈالی اوراس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''یاسمین مجھے اجازت دو !''

''آج نہیں''۔۔۔۔وہ منمنائی۔

''بھئی اب گلہ نہیں ہونا چاہئے ۔ہمیشہ شکوہ کرتی تھیں کہ میں تمہارے پاس آکر نہیں ٹھہرتا ۔قدرت نے ہی بے بس کر کے تمہارے رحم وکرم پر ڈال دیا۔کہواب تو دل بھر گیا ہے نا؟''

''احسن بھائی میرا دل کبھی نہیں بھرے گا۔آپ نے تو جنگلوں میں ڈیرے لگا لئے ہیں۔کوئی کرے تو کیا؟''اس کی آنکھوں میں آنسوامنڈ آئے۔

دراصل اس جگہ سے اب اتنی وابستگی ہوگئی ہے کہ چھوڑنے کے تصور سے ہی تکلیف ہوتی ہے۔

''نعیم آپ کوٹھہرانے کی ساری ذمہ داری مجھ پر ڈال گئے ہیں۔آکر بگڑیں گے۔''

میں اسے ملنے کے لئے ہسپتال جاؤں گا۔وضاحت کردوں گا۔گھبراؤ نہیں ۔یاسمین اتنے دن تو ہو گئے ہیں۔میرے مریض میرے انتظار میں ایک ایک دن جانے کیسے گزار رہے ہوں گے؟''

باب نمبر:۳۸

جھٹ پٹے کے وقت زرغونہ نے اپنے کمرے کے دریچے سے گھر کے بیرونی برآمدے میں آکا کو کھڑے دیکھا تو حیران رہ گئی۔پہلی بار تو اسے اپنی بصارت پر شبہ سا ہوا،لیکن دوبارہ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس کی پہچان نے غلطی نہیں کھائی ،اور اس کا فوری ردعمل اس کے بغیر سوچے سمجھے بھاگنے پر ہوا۔وہ اس کے گلے لگ جانا چاہتی تھی۔لیکن کمرہ طے کرتے کرتے بہت سے خیالات نے آگے بڑھ کر راستہ روک دیا۔تیزی سے اٹھتے قدم دبیز قالین میں دھنس کر رہ گئے۔

''آکا اس کے گھر کیسے آئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ آئے ہیں تو کس نے بھیجا ہے؟''قیاس آرائیوں کی ایک لمبی قطار تھی جو دماغ میں یکے بعد دیگرے جگہ لیتی جا رہی تھی۔

''کیا ملنے سے انکار کر دیا جائے یا ملا جائے،کون سی صورت بہتر ہے۔''اس نے خود سے دریافت کیا۔

''نہ ملا جائے۔''ایک گوشے سے صدا آئی۔

''نہیں نہیں۔''اس نے سر جھٹکا۔

''بڑھاپا قابل تعظیم ہے۔وہ چل کر میرے پاس آیا ہے۔میں جو کچھ بھی ہوں ظاہر ہوچکی ہوں۔اس لئے اب ملنے سے پہلوتہی کیوں؟''

اور یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ ڈائنگ روم سے ملحقہ برآمدے میں آ گئی۔

''آ کا آپ؟'' کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی۔

''زرغونہ میری بیٹی !ان بوڑھی آنکھوں میں محبت ہی محبت تھی۔ان پھیلے ہوئے بازوؤں کواس نے دیکھا،بے اختیار آگے بڑھی اوران کے سینے سے لگ گئی۔

''کیسی بے لوث محبت ہے یہ۔کتنا سکون اورشانتی ہے یہاں۔''اس کی آنکھیں پیار کےاس بے پایاں اظہار پر بھیگ رہی تھیں۔''

کافی وقت گزر گیا۔وہ آہستہ سےان کے بازوؤں سے باہر نکل آئی۔

''آیئے آ کا اندر چلتے ہیں۔''وہ انہیں بازو سے پکڑے کمرے میں لے آئی۔اور انہیں صوفے پر بٹھاتے ہوئے وہ خودبھی ان کےقریب بیٹھ گئی۔

''آپ ٹھیک ہیں نا؟''۔۔۔اس نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے دیکھا۔

''بیٹے !میرے ٹھیک رہنے کوتو مارو گولی۔وہ جس سے میری زندگی ہے،وہ جو میری بوڑھی آنکھوں کا نور ہےاسے قدرت نے نئی زندگی دی۔کف دست ملتا ہوں بیٹے کہ وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں اس کے پاس سے چلا گیا۔''ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب تھیں۔

''کیا ہوا آ کا؟''

وہ سمجھ تو گئی تھی کہ کس کی بیماری کا ذکر ہےلیکن انجان بن گئی۔

''احسن بیمار تھا،ایسا پگلا ہے۔اس نے تمہیں اطلاع نہیں دی۔''

''کب بیمار تھے؟''۔۔۔آواز میں سکون تھا۔

''کافی دن ہو گئے ہیں۔یہیں شہر میں نعیم میاں کے پاس ہی تھے۔وہ اس کا رشتہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ گہرا دوست بھی ہے۔واقعی انہوں نے دوستی اور رشتے داری کا حق ادا کر دیا ہے۔بہت مانتے ہیں میاں بیوی اسے۔''

''آپ کے بھانجے کا کیا حال ہے اب آ کا؟''اس نے موضوع بدل دیا۔

''وہ خدا کے فضل سے اب روبصحت ہے۔اسی کی بیماری نے تو اتنا طول کھینچا کہ آنہ سکا۔دراصل وہ میری اکلوتی مرحومہ بہن کا بیٹا ہے۔بس رشتے داروں میں ایک اسی کا دم سلامت ہے۔پیغام ملا تو جانا پڑا۔بیٹے مجھے یہ سن کر کتنا دکھ ہوا؟ کہ تم گئیں اور میں وہاں نہیں تھا۔احسن مجھے بتا رہا تھا کہ آ کا زرغونہ آپ کو بہت یاد کرتی تھی۔میں نے کہا میری بیٹی جو ہوئی یاد کیوں نہ کرتی۔''

''احسن بتا رہے تھے۔''اس کے کان بجے۔دل میں خوشی کی ایک موج آئی۔

''آ کا آپ کو میرے گھر کا پتہ کیسے چلا؟''۔۔۔یہ سوال کب سے وہ پوچھنا چاہتی تھے۔

''احسن بیٹے نے مجھے اچھی طرح سمجھایا تھا۔تلاش کرنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔''

''احسن نے سمجھایا تھا کیوں ؟معلوم ہوتا ہے یاسمین نے سب کچھ بتا دیا ہے۔''ابھرتی موج واپس لوٹ رہی تھی۔

''بیٹے تم احسن سے ناراض ہو؟''اس نے اپنے بوڑھے ہاتھ اس کے شانوں پر رکھتے ہوئے محبت بھری آواز میں پوچھا۔

''نہیں آ کا یہ آپ سے کس نے کہا؟''

اس نے جھکا ہوا سر فوراً اٹھایا۔

''احسن بتا رہا تھا۔ کہ آ کا زغونہ مجھ سے ناراض ہے۔''

''میں اس پر غصے ہوا تھا کہ وہ تو بڑی پیاری بٹیا ہے۔ تم نے یقیناً اسے کچھ کہا ہوگا؟''

اپنے کان سائیں سائیں کرتے محسوس ہوئے۔

''یہ کیا سن لیا ہے۔ یہ کیا سنا دیا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

نہیں نہیں یہ غلط ہے۔ میرے کانوں نے دھوکا کھایا ہے۔'' بے اعتمادی سے آ کا کی طرف دیکھا۔

''غصہ نہیں کرتے بیٹے۔ چلو میں تمہیں لینے آیا ہوں۔'' اور عین اُسی لمحے اُسے اپنے سینے کے خول میں کوئی چیز تڑاخ سے ٹوٹتی محسوس ہوئی۔

''آ کا کو لینے کے لئے بھیجا ہے۔ مجھے بلایا ہے۔ یعنی میں چل کر خود جاؤں۔'' توہین کے اس احساس پر اس کے کان جل اٹھے۔

''میں ابھی آتی ہوں آ کا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دوسرے کمرے کی طرف لپکی اس کی چال میں غیر معمولی تیزی تھی۔ چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ فون والے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہاں ممتاز بائی اور سرلا بائی موجود تھیں۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر ان پر ڈالی اور نمبر گھمانے لگی۔

''ہیلو'' اس کی آواز میں کاٹ دینے والی تیزی تھی۔

اور جوں ہی اسے معلوم ہوا کہ ریسیور یاسمین کے ہاتھ میں ہے وہ یک دم پھٹ پڑی۔

میں نے آپ پر واضح کیا تھا کہ مجھے اپنا وقار بہت عزیز ہے آپ نے میرے

ساتھ اخفائے راز کا وعدہ کیا تھا لیکن.....ایفائے عہد نہیں کیا نا آپ نے !''

''کیا مطلب زرغونہ؟ میں سمجھی نہیں۔کھل کر بتاؤ۔''یاسمین نے قدرے پریشانی سے کہا۔

''نہیں زرغونہ تمہیں اس غلط فہمی میں کس نے ڈال دیا ہے؟ میں نے تمہارے ساتھ کیا ہوا وعدہ پوری طرح نبھایا ہے۔اور تب اس نے ساری حقیقت اسے سنا ڈالی۔زرغونہ میں تمہیں بھی اس سے آگاہ کرنا چاہتی تھی۔لیکن جب بھی فون کیا ہر بار کسی نے کہا تم گھر پر نہیں ہو۔عدنان ٹھیک نہیں تھا اس لیے میں خود نہ آسکی۔کیا احسن آئے ہیں؟اس نے پوچھا؟''

''نہیں آ کا آئے ہیں اور احسن نے انہیں مجھے لانے کے لئے بھیجا ہے۔''اس کی آواز میں بھرپور طنز تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے۔''یاسمین نے استفسار کیا۔

''میرا خیال آپ جانتی ہی ہیں۔''

''ٹھیک ہے لیکن آ کا کو اطمینان سے ٹال دینا۔''

''فون بند کر کے وہ دونوں کو ایک دوسرے کا منہ تکتا چھوڑ کر ان کے پاس آگئی۔

''تم کہاں چلی گئیں تھیں بیٹے تم نے مجھے کچھ بتایا نہیں؟''

''آج رات آپ میرے پاس گزاریں گے۔اطمینان سے باتیں ہوں گی؟''وہ اب خاصی پرسکون نظر آرہی تھی۔

''نہیں مجھے ابھی جانا ہے احسن بیٹے کے کئی کام کرنا ہیں۔''

''آ کا آج آپ میرے مہمان ہوں گے،جو بھی کام ہیں انہیں کل کے لئے اٹھا رکھیئے۔''

اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''لیکن صبح پھر تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''ابھی شام ہے۔صبح کی بات چھوڑیئے آ کا۔میں آپ سے چائے کا بھی نہیں پوچھ سکی۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے برقی گھنٹی کا بٹن دبایا۔نوکر آیا تو چائے لانے کے لئے کہا۔

چائے آئی اور ساتھ ہی ممتاز بائی کے بلاوے کا پیغام بھی۔

انہیں چائے وغیرہ اچھی طرح پلانے کے بعد وہ ماں کے پاس گئی۔ممتاز بائی شعلہ بنی ہوئی تھی۔

''یہ بڈھا کون ہے؟''

''تمہیں کیا دلچسپی ہے؟''اس کا جواب تلخی لئے ہوئے تھا۔

''حرام زادی ! مجھ سے دلچسپی کا پوچھتی ہے۔یہ میرا گھر ہے۔میں اس کی مالک ہوں۔اور یہاں آنے والے ہر آدمی کے متعلق جاننا میرا فرض ہے۔''وہ بھڑک رہی تھی۔

''تم اکیلی کیا اس گھر میں رہتی ہو۔یہاں چند اور بھی لوگ ہیں۔جن کے اپنے نجی مسائل ہیں۔کسی کو کسی کے معاملات سے کیا دلچسپی؟ کوئی مجھ سے ملنے کے لیے آئے یا کسی اور سے۔آخر تمہیں کرید کیوں ہو؟''

''سور کی اولاد۔تم جانتی ہو میں کون ہوں؟''

''فحش کلمات سے مجھے نوازنے کی ضرورت نہیں۔باقی رہا تمہیں جاننے کا سوال تم نامی گرامی طوائف ممتاز بائی ہو۔اچھی طرح جانتی ہوں۔''

اس کا انداز بے پایاں اطمینان لئے ہوئے تھا۔

''تم بھول رہی ہو میں تمہاری ماں ہوں۔تمہاری سرپرست ہوں۔''

''کون کہتا ہے کس نے کہا ہے؟ میں تمہیں یہ مقدس درجہ دینے کے لئے تیار نہیں ۔''

''حرام زادی! ۔۔۔وہ چوٹ کھائی ناگن کی طرح تڑپی اور شیشے کا گلاس اٹھا کر بھرپور طاقت سے اس کی طرف اس تیزی سے پھینکا کہ اگر وہ ایک طرف نہ ہٹ جاتی تو اس کی آنکھ ہی نے پھوٹ جانا تھا۔

گلاس اتنی قوت سے پھینکا گیا تھا کہ قالین پر گرنے کے باوجود ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

''ہاتھوں کو قابو میں رکھنا سیکھو۔ وگرنہ میں انہیں توڑ دوں گی۔'' وہ چیخی

''کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا !''۔۔۔وہ غراتے ہوئے اس کی طرف لپکی ۔بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دینے کی کوشش کی ہی تھی کہ سرلا نے آ کر ہاتھ تھام لیا۔

''کچھ پاگل ہوگئی ہو کیا؟ ہوش میں آؤ۔''

اس نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

''ہٹو چھوڑو مجھے۔'' اس نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''اس کے ابلتے خون کو مجھے ٹھنڈا کر لینے دو۔''

لیکن سرلا نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''اس ڈائن کو پوچھو یہ رات کو اسے کیوں ٹھہرانا چاہتی ہے۔''

وہ اس کے بازوؤں میں گھری چلائی۔

''میری مرضی !'' وہ بدستور اکڑی ہوئی تھی ۔

''بری بات ہے۔'' سرلا بائی نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں راتوں کو سیٹھ آتے ہیں ۔داد عیش دیا جاتا ہے ۔جسم بکتا ہے ۔وہ بری بات

نہیں ۔لیکن اگر میں نے ایک معزز انسان کورات گزارنے کے لئے کہا ہے ۔تو یہ بری بات ہوگئی ۔''

''بہت بے لگام ہوتی جارہی ہو زرغونہ !'' سرلابائی نے تلخی سے ڈانٹ دی۔

''وہ معزز آدمی ہے حرام زادی کا یار جولگتا ہے ۔'' ممتاز بائی دھاڑی۔

''میں نے ایک بار کہہ دیا ہے ۔فضول بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ۔''

''زرغونہ جاؤ یہاں سے''۔۔۔سرلابائی نے کہا۔

''میں یہاں سے نہیں جاؤں گی ۔کیا میں ایک انسان کورات نہیں ٹھہرا سکتی ۔'' اس نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔

''ہرگز نہیں ۔''

وہ باہر آ گئی ۔اس کا دل اپنی بے بسی پر دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا ۔اتنی بڑی کائنات میں ایک جگہ بھی تو ایسی نہ تھی جو اس کی اپنی ہوتی ۔کہتے ہیں گھر انسان کے لیے جنت ہوتا ہے ۔اس کے لیے تو وہ بھی جہنم تھا۔

'' کیسے ڈرائنگ روم میں جائے گی ۔کیسے ان کا سامنا کرے گی؟'' اس کا دماغ پھٹ رہا تھا ۔لیکن جانا تھا ۔کوئی انتظار کررہا تھا۔

شکستہ قدموں سے کمرے میں آئی ۔بوڑھی آنکھوں نے اس کے چہرے پر سب کچھ پڑھ لیا تھا ۔کان پہلے ہی بہت کچھ سن چکے تھے ۔

''تو روتی کیوں ہے بیٹے؟''

سادہ سے یہ الفاظ اس زبان سے اس کے لئے نکلے جس سے بظاہر اس کا کوئی خونی رشتہ نہ تھا ۔جگری رشتے تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے ۔لیکن بیرونی رشتے بھرپور محبت دے رہے تھے ۔

''پگلی ہے تو۔ مجھے ٹھہرانے کے لئے اتنا ہنگامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں یہاں رہوں یا کہیں اور، میری محبت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا۔ تو نے یہ کیوں نہیں سوچا؟''

اس کے آنسو تیزی سے بہہ رہے تھے اور آکا پریشان ہو رہے تھے۔

''بیٹے !زرغونہ بیٹے !''انہوں نے اسے اپنے گلے سے لگایا۔

''تم یہاں کس کی اجازت سے آئے بڑھے؟''

ممتاز بائی کمرے میں آ کر چنگھاڑی۔

وہ آنسو جو آکا کے خشک کروانے پر بھی خشک نہ ہو رہے تھے۔ یک دم اس آواز پر بہنے بند ہو گئے۔

''تمہیں یہ پوچھنے کا کوئی حق نہیں، وہ میرے مہمان ہیں۔''

اس کی آواز بھرائی ہوئی ہونے کے باوجود تیز تھی۔

''بیگم صاحبہ میں اس سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ آپ ناراض مت ہوئیے۔ میں ابھی چلا جاتا ہوں۔''انہوں نے عاجزی سے کہا۔

''یاد رکھنا اگر کبھی دوبارہ یہاں قدم رکھا تو ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔''

''ممتاز بائی''زرغونہ کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

''تم حد سے تجاوز کر رہی ہو۔یہ زرغونہ کی آواز تھی پہلی مرتبہ اس نے اسے نام سے پکارا۔

''سور کی بچی اکڑ دکھا رہی ہے۔۔۔چل دفع ہو یہاں سے۔''

اس نے زناٹے دار تھپڑ اس کے رخسار پر جڑ دیا۔

''اسے مت ماریئے بیگم صاحبہ !میں جا رہا ہوں۔''

آکا آناً فاناً کمرے سے نکل گئے۔

ماں بیٹی گتھم گتھا ہو گئیں۔ بمشکل سرلا بائی اس کے چنگل سے زرغونہ کو نکال کر
دوسرے کمرے میں لے گئی۔

باب نمبر:۳۹

''سرلا !میری بات سنو۔''

وہ بغیر کچھ کہے اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے قریب پہنچ گئی۔

سرگوشی میں اسے کچھ سنایا گیا۔

''نہیں......نہیں......ممتاز''

وہ سہم کر یوں پیچھے ہٹی جیسے اچانک کسی نے ڈنگ ماردیا ہو۔

''کیوں؟میں اسے دنیا سے نیست و نابود کر دینا چاہتی ہوں۔سرلا اس سے پہلے کہ وہ من کی مراد پائے۔''

''لیکن یہ ظلم ہوگا۔یہ گناہ ہوگا۔''

اس کی آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔

ہوں !ممتاز بائی نے طنزیہ انداز میں اسے گھورا۔

''تو سوچو ہے کھا کے بلی حج کو چلی۔بہت خیال ہے تمہیں گناہ کا، بہت خوف زدہ ہو تم ظلم کرنے سے۔کیا اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا؟''

وہ گردن کو دائیں شانے پر جھکائے، آنکھوں میں سانپ کی سی چمک لئے اسے گھور رہی تھی۔

''مجھے اس سے کب انکار ہے ممتاز؟ !اپنی اولاد کو اپنے ہی ہاتھوں....؟ اس نے گھگھیاتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''بھول گئی ہو سرلا بائی شاید! یاد کرو کتنی اولادوں کو سر اٹھانے سے پہلے ہی جہنم رسید کر دیا گیا۔۔۔۔بتاؤ کیا ایسا نہیں کیا گیا؟''

اس نے طنز کا ایک ایک تیر سوچ سوچ کر سرلا بائی کے سینے پر مارا۔

''ٹھیک کہتی ہو۔ایک طوائف کا اس کے بغیر گزارہ نہیں۔لیکن تم یہ بھول رہی ہو کہ پندرہ سولہ سال کی جوان لڑکی اور دو ماہ کے گوشت کے لوتھڑے میں فرق بھی بہت ہے۔''

''کوئی فرق نہیں۔گناہ دونوں کے لئے ایک جیسا ہے۔سرلا !میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ ان خوشیوں کو حاصل کرے جن کے لیے وہ تڑپتی رہی ہے۔اس نے مجھے دہکتے ہوئے کوئلوں پر جی بھر کر جلایا ہے۔کیا میں اسے چھوڑ دوں؟ اپنی ازلی دشمن کو من مانی مراد حاصل کرنے دوں۔ایسا کبھی نہیں ہوگا۔کبھی نہیں ہو سکتا، میں اسے تڑپا تڑپا کر تماشہ دیکھنا چاہتی ہوں۔''

اس کی آنکھیں اتنی خوفناک نظر آ رہی تھیں کہ سرلا بائی نے تاب نہ لاتے ہوئے اپنی نظریں جھکا لیں۔

''لیکن تم خطاوار ہو۔۔۔تمہاری بھی غلطی ہے میں نے تم سے بار بار کہا کہ ہمیں تاخیر سے کام نہیں لینا چاہئے۔لیکن تمہارے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اب جب پانی سر سے گزر گیا ہے تب تمہیں ہوش آیا ہے۔''

''مجھے اگر غلط اطلاعات ملتی رہیں تو اس میں میرا قصور کیا؟''

''کچھ بھی ہو ممتاز میں تمہیں اس بربریت کی اجازت کبھی نہیں دوں گی۔''اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''سرلا میں نے کبھی شکست تسلیم نہیں کی۔وہ میرے ہاتھوں بچ کر نکل جائے یہ ممکن نہیں۔''

''تمہیں ایسا کرنے کے لئے کون کہتا ہے؟اسے جو چاہو سزا دو میں تمہارے ساتھ ہوں۔لیکن جو تمہارا انداز فکر ہے،وہ غلط ہے۔

تم حقیقت کو نظر انداز کر رہی ہو سرلا۔اچھی طرح جانتی ہو،ہر ظلم اس پر توڑا گیا ہے۔ہر سزا اسے دی گئی ہے۔لیکن وہ جھکی؟اس کی گردن خم ہونے کی بجائے اکڑتی ہی چلی گئی اور اب ضرورت ہے اس اکڑاؤ کے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں۔''

اور اگر کہیں یہ ٹکڑے تمہیں ہی زخمی کر گئے تو............؟''اس نے طنزاً کہا۔

وہ سرلا بائی کی بات پر جل ہی تو اٹھی۔مگر کمال ڈھٹائی سے بولی۔

''پہلے ہی چھلنی ہوں۔مزید چھلنی ہونے سے رہی۔''

''معلوم ہوتا ہے۔آہنی زنجیریں پہننے کو تمہارے ہاتھ تڑپ رہے ہیں۔''

''سرلا!''وہ تلملا اٹھی تھی۔

''میں کچی گولیاں کھیلنے کی عادی نہیں۔''وہ چیخی۔

''تمہاری عقل پر پردے پڑ گئے ہیں۔وہ اب بازار حسن کی گمنام زرغونہ نہیں بلکہ شہرت کے آسمان پر چمکنے والی سبینہ ہے۔اس کی موت کوئی معمولی سانحہ نہ ہوگا۔تمہارے اور اس کے تعلقات کو سٹوڈیو کی دنیا میں تقریباً سبھی جانتے ہیں۔کیا یہاں بھی پیسہ چلاؤ گی؟کیا سیٹھ نواز تمہارے گناہ پر پردہ ڈال دے گا؟کوئی تمہاری باتوں پر اعتبار نہیں کرے گا۔تم زمین کی پہنائیوں میں جا کر بھی یہ کام کرو گی تو بھی پکڑی جاؤ گی۔سوچو تمہارا مقام کیا

ہوگا۔بازارِ حسن میں یہ خبر کتنی خوشی سے سنی جائے گی۔حاسدوں کو ہنسنے کا موقع ملے گا۔رقیب خوشیاں منائیں گے کہ ان کی راہ کا کانٹا نکل گیا۔

سوچو اور غور کرو تم کیا کرنا چاہتی ہو؟

سرلابائی نے تلخ حقیقت کا ایک ایک رخ اسے دکھایا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔دور نکل جاؤ میرے کمرے سے۔''وہ غصے سے چلائی۔

سرلابائی اسے کمرے میں چھوڑ کر خود باہر آ گئی۔کافی ضربیں لگا آئی تھی۔سوچ رہی تھی کچھ دیر بعد دماغ ٹھکانے آ جائے گا۔

''کیا کہنے ہیں سرلا تمہارے۔۔۔۔یہ تم ہو جو مجھے ظلم اور گناہ کا فلسفہ پڑھا رہی ہو۔یہ تم ہو جو اندیشوں کے بھوت دکھا دکھا کر میرے پاؤں اکھیڑ رہی ہو۔آہ میری سادہ لوحی نے ہمیشہ تم پر اندھا اعتماد کیا ہے۔میں اگر یہ کہوں کہ اس کے بگاڑ میں تمہارا بہت ہاتھ ہے تو کچھ غلط نہیں۔سرلا تم نے میرے اعتماد کو ایسی شدید ضرب پہنچائی ہے کہ آج سالوں بعد مجھے اس کا اندازہ ہوا ہے ظلم ہے۔۔۔یہ گناہ ہے۔۔۔یہ بربریت ہے۔۔۔''

سرلابائی کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجے۔''ٹھیک ہے اگر تمہیں اس سے اتنی ہی محبت ہے تو گھبراتی کیوں ہو؟ اس کے پاس ہی تمہیں بھی پہنچا دوں گی۔بس حکمت عملی سے کام لینا ہوگا۔''

رات کے نو بجے اس نے منہ دھویا اور تازہ دم ہو کر سرلا کے کمرے میں گئی۔وہ ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹکائے سوچوں میں گھری بیٹھی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو سرلا؟''قریب پہنچ کر اس نے آواز دی۔

چونک کر سرلا نے دیکھا۔اور اس کے چہرے پر بشاشت سی دیکھ کر اس کی بھی ڈھارس بندھی۔

''کچھ نہیں بس یونہی بیٹھی تھی ۔تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہوں ! کھانا لگ گیا ہے چلو۔''

شال ٹھیک کر۔تے ہوئے وہ اس کے ساتھ چلنے لگی ۔

میز انواع واقسام کے کھانوں سے سجی ہوئی تھی ۔لیکن سرلا بائی کی طبیعت کچھ کھانے کے لئے نہیں چاہ رہی تھی۔

''وہ کہاں ہے؟اسے اطلاع نہیں دی؟'' ممتاز بائی نے ناک چڑھا۔تے ہوئے خادمہ سے زرغونہ کے بارے میں پوچھا۔

''وہ باہر گئی ہیں۔''

''کب؟''

''کار لے کر گئی ہے؟''اس نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔''خادمہ نے جواب دیا۔

''جاؤ گیراج میں کار دیکھ کر آؤ۔''

''میرا خیال ہے سمیعہ کے ہاں گئی ہے۔''سرلا بائی نے آہستگی سے کہا۔

''تمہیں بتایا تھا؟''

''نہیں ریشماں نے بتایا ہے۔سمیعہ آئی تھی ۔اور زرغونہ اس کے ساتھ چلی گئی ہے۔ممتاز تم نے کیا سوچا ہے؟''اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''چلو میں تمہاری مانے لیتی ہوں ۔لیکن اس پر تو وہی بات صادق آتی ہے ۔

وہی ہے چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے ۔

اس کے لیے بھی کچھ سوچا ہے؟''

''یہ میرا کام رہا۔اور اس کے کرنے کا میں وعدہ کرتی ہوں۔''

''لیکن لڑ کےوالا چکراگر کامیاب ہوگیاتو؟''

''ایسانہیں ہوگا،مطمئن رہو۔''

''سیٹھ قادر کے ہاں مجرا کب ہے؟ تاریخ نوٹ کی ہوئی ہے؟اس نے دریافت کیا۔

''تیرہ کو۔''سرلابائی نے جواب دیا۔

''اچھی طرح یاد ہے؟''

''کیوں نہیں۔دس مرتبہ تو ان کے ٹیلی فون آچکے ہیں۔''

''شاداں کے ہاں کب جانا ہے؟''

''پندرہ کو۔''

''بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔میں نے تو کوئی خاص تیاری بھی نہیں کی۔''

''تیاری کیا کرنی ہے؟''سرلابائی نے سرسری کہا۔

''لواور سنو۔اتنے دن ہوگئے کسی ساز کوچھوکرنہیں دیکھا۔گانے کی ریاضت ابھی کرنی ہے۔روز کہتی ہوں صبح سویرے باقاعدگی سے ایک گھنٹہ مشق کرلیا کروں۔لیکن براہو اس سستی کا!''

''تیرہ تاریخ کی سہ پہر ممتاز بائی تیار ہورہی تھی۔خوب صورت اور قیمتی لباس اس پر جگمگاتے زیورات نے حسن کوچار چاند لگا دیئے تھے؟''

''بڑی بیگم صاحبہ !''ریشماں نے پردہ اٹھا کراندر آنے کی اجازت طلب کی۔

ممتاز بائی نے گھوم کردیکھااور سر کے اشارے سے اندر آنے کے لئے کہا۔

تھوڑی دیر تک وہ خاموش کھڑی کچھ سوچتی رہی۔ترچھی نگاہوں سے اس نے پہلے ریشماں کودیکھااور پھر دروازے کو۔

ہاتھ اور آنکھوں کے اشاروں سے اس نے ریشماں کو دروازہ بند کرنے کے لئے

کہا۔

بغیر آواز پیدا کئے اُس نے دروازہ بند کر دیا۔اور واپس آ کر مودبانہ انداز میں اُس

کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

ممتاز بائی نے الماری کھولی۔کچھ نکالا۔اور تیزی سے ریشماں کی مٹھی میں تھما دیا۔

ملازمہ کا ہاتھ اپنے سینے کی طرف گیا اور ایک منٹ بعد خالی ہو گیا۔

سرگوشیوں میں ڈھلی آواز میں اس نے ہدایات ایک بار پھر اس کے ذہن نشین

کروائیں۔

''جاؤ اور احتیاط سے یہ کام کرنا۔''اس نے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

''تم اور تمہاری چہیتی ایک ہی رات میں جہنم کی سیر کرو گی۔''اس نے آئینے میں

خود پر گہری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

باب نمبر:۴۰

سیاہ بڑے بڑے کوئلے جن کا نچلا حصہ دھیرے دھیرے سرخ ہو رہا تھا۔یہ کوئلے ہلکا ہلکا کثیف سا دھواں بھی چھوڑ رہے تھے۔حرارت کا خوشگوار احساس بھی فضا میں رچا ہوا تھا۔کمرے میں مکمل خاموشی تھی، البتہ کبھی کبھی کوئلے چٹخنے کی آواز اس سکوت کو توڑ دیتی۔آتش دان کے عین سامنے بیٹھے ہوئے احسن ان کوئلوں کی سیاہی دیکھ رہے تھے۔جو تیزی سے سرخی میں بدلتی جا رہی تھی۔سلاخوں سے ہلکی ہلکی راکھ نیچے گر رہی تھی۔

وہ سوچ رہے تھے۔سوچ کا مرکز زرغونہ تھی۔آ کا کو واپس آئے کافی دن ہو رہے تھے۔انہوں نے ماں بیٹی کے درمیان جھگڑے کی مکمل تفصیل سے انہیں آگاہ کیا تھا۔اب وہ جانا چاہتے تھے اور اُسے اُس غلیظ ماحول سے ہمیشہ کے لیے نکال لانا چاہتے تھے۔

انہیں اس بات کا شدید صدمہ تھا کہ زرغونہ نے خود کو کیوں چھپایا؟ کیا وہ اگر خود کو ظاہر کر دیتی تو میں اسے نہ اپناتا۔جب وہ اس ماحول سے متنفر تھی تو کیوں نہیں چھوڑ کر آ گئی۔میرے گھر اور دل کے دروازے اُس پر کھلے تھے۔اس نے یہ کیوں نہیں سمجھا؟

وہ خود سے الجھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

پانچ چھ لب گور مریض گزشتہ تین چار دنوں سے کلینک میں داخل تھے۔ان کی حالت کافی مخدوش تھی۔ان کی خطرناک حالت کے پیش نظر وہ جلدی نہ جا سکے تھے۔اب وہ کافی بہتر تھے۔ڈاکٹر اور کمپونڈر کو وہ آج ہدایات دے آئے تھے۔اور کل جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے اٹھے۔

''ا.....ح..........س.........ن..........''

آواز پھر سنائی دی۔صاف آواز....اس دفعہ تو ان کے کان بج اٹھے تھے۔وہ دائیں بائیں گھوم گئے۔اور جب کوئی نظر نہ آیا تو تیزی سے لپک کر باہر آئے۔نور برآمدے میں کھڑا تھا۔

''نور مجھے کس نے آواز دی ہے؟'' انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔

''نہیں صاحب کسی نے نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''نہیں نور مجھے کسی نے پکارا ہے۔دیکھو کون ہے؟''

آ کا دوسرے کمرے سے نکل کر ان کے پاس آئے۔انہیں یوں گھبرائے گھبرائے کھڑے دیکھا تو پوچھا۔

''کیا بات ہے بیٹے !''

''آ کا آپ نے مجھے آواز دی تھی؟''

''نہیں تو بیٹے !شاید تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔بعض دفعہ ایسا ہو جاتا ہے۔کان بجنے لگتے ہیں۔اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پکارا ہے۔''

''نہیں آ کا میرے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا۔''

وہ اپنے ہاتھ مسل رہے تھے۔گہرا اضطراب ان کے چہرے پر تھا۔وہ بار بار ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

کمرے کے وسط کھڑے ہو کر انہوں نے خود غور کیا۔اپنے آپ کو ٹٹولا۔

''یہاں تو کوئی نہیں ہے۔کس نے آواز دی ہوگی؟ کیا یہ میرا وہم ہے آ کا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

دیوار پر لگے کلاک پر ان کی نظریں گئیں۔چھ بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔اس کی ٹک ٹک خوفناک معلوم ہوئی۔قلبی محسوسات پر دوبارہ غور کیا۔

ایک ان جانا سا خوف محسوس ہوا۔

چھٹی حس نے سرگوشی کی۔

اور اگلے لمحے وہ کپڑے بدل رہے تھے۔ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''کہاں جا رہے ہو بیٹے؟'' آ کا نے انہیں یوں بھاگتے دیکھ کر پکڑ لیا۔

''مجھے چھوڑ دیجیے آ کا۔میں شہر جا رہا ہوں۔گھبرانے کی ضرورت نہیں کل تک لوٹ آؤں گا۔''

کیا چیز تھی۔۔۔۔کون سا احساس تھا جو انہیں ہوا کی طرح اڑائے لیے جا رہا تھا۔کہکشاں ہوٹل سے انہوں نے کار لی۔اور بارہ بج کر پینتالیس منٹ پر وہ شہر میں تھے۔

سردی کی وجہ سے سڑکیں ابھی سنسان ہو گئی تھیں۔مختلف سڑکوں پر تیزی سے بھاگتی کار موڑ پر موڑ کاٹ رہی تھی۔کار کی رفتار اس وقت سو میل تھی۔

شہر کی اس اضافی بستی میں داخل ہوئے جہاں زرغونہ رہتی تھی۔زرغونہ کا گھر ڈھونڈنے میں انہیں قدرے دقت کا سامنا کرنا پڑا۔

کار ایک جھٹکے سے چرچراتے ہوئے رک گئی۔گیٹ بند تھا۔اوپر سے ہاتھ بڑھا

کر کھولنے کی کوشش کی ۔لیکن ناکام رہے ۔

بغیر ایک لمحہ ضائع کیے وہ گیٹ پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گئے ۔

کسی کے گھر یوں چوروں کی طرح داخل ہونے کی کوشش جرم تھی ۔قانونی اور اخلاقی لحاظ سے وہ مجرم تھے ۔لیکن ایسی باتیں سوچنے کا ہوش کہاں تھا۔

برآمدے میں آئے ۔دائیں بائیں اور سامنے کمروں کے دروازے تھے ۔ٹیوب دودھیا روشنی بکھیر رہی تھی ۔

انہوں نے کچھ سوچا اور اپنے دائیں ہاتھ کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی ۔دروازہ اندر سے بند تھا ۔یہی کوشش بائیں اور سامنے والے دروازوں پر کی گئی ۔لیکن کامیابی نہ ہوئی ۔تیزی سے وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے اور کوٹھی کے اوپر سے چکر کاٹ کر پچھلی طرف آگئے ۔گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا محتاط قدموں سے آگے بڑھے ۔برآمدے میں آکر کھڑکی سے کمرے کے اندر جھانکا۔

کمرے میں اندھیرہ تھا۔کچھ نظر نہ آیا۔چند لمحے وہاں کھڑے سوچتے رہے پھر جی کڑا کر وہ داہنے حصے کے آخری کمرے میں داخل ہوئے ۔یہ کھانے کا کمرہ تھا۔اور آگے بڑھے ۔ملحقہ کمرے کا پردہ اٹھایا۔

پردہ ہاتھوں میں پکڑا رہ گیا ۔سامنے بستر پر زرغونہ لیٹی تھی ۔کتاب سینے پر تھی اور منہ سے بلبلے سے نکل رہے تھے ۔وہ سو رہی تھی ۔

''زرغونہ !زرغونہ !''انہوں نے جھنجھوڑا۔

لیکن وہ ہوش میں ہوتی تو آنکھیں کھولتی ۔

ٹیبل لیمپ اٹھا کر وہ اس کے قریب لائے ۔جھاگ کو بغور دیکھا اور سر سے لے کر پاؤں تک کانپ گئے ۔لیمپ لرز گیا اسے میز پر پٹختے ہوئے انہوں نے بغیر ایک لمحہ

توقف کئے اُسے اپنے بازوؤں پر اٹھایا اور کمرے سے بھاگ نکلے۔یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔اور نہ ان کا سامنا کسی نوکر سے ہوا۔وگرنہ مزاحمت کا فوری امکان تھا۔آخر رات کے وقت کسی کو یوں چوری چھپے اٹھا کر بھاگنا کوئی کھیل تو تھا نہیں۔اور وہ بھی ایک لڑکی کا۔مالکن کے نہ ہونے کی وجہ سے سب نوکر اپنے ٹھکانوں پر کمروں کے دروازے بند کیئے آرام کر رہے تھے۔

گیٹ کا دروازہ انہوں نے کھولا۔اُسے کار میں ڈالا۔کار فراٹے بھرنے لگی۔اور ان کے اپنے ذاتی ہسپتال کے سامنے جا کر رک گئی۔نائٹ ڈیوٹی کے ڈاکٹروں نے انہیں دیکھا تو ڈیوٹی روم سے فوراً باہر نکل آئے۔

''ایمرجنسی روم خالی ہے جواد!''انہوں نے دریافت کیا۔

''جی ہاں!جواب دیا گیا۔

انہوں نے زرغونہ کو باہر نکالا۔اور بازوؤں پر اٹھائے کمرے میں آئے۔اور اسے بیڈ پر احتیاط سے ڈال کر انہوں نے بقیہ ڈاکٹروں کو سامان لانے کے لئے ہدایات دینا شروع کر دیں۔

اس کے چہرے پر روشنی پڑتے ہی سب ڈاکٹروں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ایک نظر ہی کافی تھی پہچاننے کے لئے۔

''جلدی کرو حسن!''انہوں نے انہیں ہوشیار کیا۔

زہر کافی سرایت کر گیا تھا لیکن حالت اتنی خطرناک نہ تھی۔زندگی کی قوی امید تھی۔ساری رات احسن اور ڈاکٹروں کی اس پر جھکے گزر گئی۔

صبح صادق کے قریب جب احسن نماز ادا کرنے کے لئے جانے لگے تو انہوں نے ڈاکٹر حسن سے کہا۔

''آپ لوگ انہیں پہچانتے ہیں لیکن یہ بات باہر نہیں نکلنی چاہئے ۔باقی لوگوں کو بھی منع کر دینا۔''

دن گزر گیا ۔اس نے دو دفعہ آنکھیں جھپکیں۔لیکن حالت کچھ زیادہ تسلی بخش نہ تھی ۔احسن اسے فوراً پراٹ لے جانا چاہتے تھے۔نو بجے رات انہوں نے ڈاکٹر جواد سے مشورہ کیااوردس بجے وہ ایمبولینس میں اسے لئے پراٹ کی طرف جارہے تھے۔جب وہاں پہنچےتو آکا کے سوا سبھی ملازم سو چکے تھے۔

''بیٹے کوئی اطلاع تو بھیجی ہوتی ۔میں تو ایک لمحے کے لئے آنکھ تک نہ جھپک سکا۔''

''میری چھوڑیئے اب اس کا فکر کیجیے ۔''انہوں نے بستر پر زرغونہ کولٹاتے ہوئے کہا۔

''زرغونہ بیٹی !''وہ بےاختیار اس پر جھک گئے۔

راستے کے ہچکولوں نے نقاہت میں اوراضافہ کردیا تھا۔رات گزرگئی۔احسن اور آکا دونوں جاگتے رہے۔گلوکوز کے قطرے نقاہت پر غالب آرہے تھے۔

صبح طلوع ہوئی ۔لیکن اس نے آنکھیں نہ کھولیں ۔دس بجے کے قریب اسے ہوش آیا۔خود پر جھکے دو انسانوں کو دیکھا۔دونوں کی آنکھیں ایک ہی کیفیت کی عکاسی کر رہی تھیں ---پریشانی---اضطراب اور تفکر۔

''زرغونہ بیٹی !زرغونہ بیٹی!''شفقت سے لبریز بوڑھی آواز اس کے کانوں میں شہد گھولنے لگی ۔

اس نے پلکیں جھپکیں ۔اور آنکھیں دوبارہ بند کرلیں۔

شام کو کہیں پھر آنکھیں کھلیں ۔ پیاس محسوس ہورہی تھی ۔حلق میں کانٹے سے

چھڑ رہے تھے۔اس کے بالکل قریب احسن کسی کتاب کے مطالعے میں منہمک تھے۔

''پانی۔''بمشکل اس کی زبان سے نکل سکا۔

خفیف سی اس آواز پر احسن نے چونک کر دیکھا۔اس کی کھلی آنکھیں دیکھ کرانہوں نے کتاب میز پر رکھ دی۔اوراس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''زرغونہ پانی چاہیے !''

اس کے ہونٹ خشک تھے۔اور آنکھیں پانی کی طلب میں پوری کھلی تھیں۔

پھلوں کا رس انہوں نے چمچ کے ذریعے اس کے حلق میں انڈیلنا شروع کیا۔پانچ چھ گھونٹ پینے کے بعد اس نے اپنی آنکھیں اور ہونٹ بند کر لئے۔

احسن نے چمچ میز پر رکھ دیا۔اسے دیکھا اور دوبارہ کتاب پر جھک گئے۔اس کی حالت تسلی بخش تھی۔

صبح جب وہ بیدار ہوئی تو اس کی حالت خاصی بہتر تھی۔اسی جگہ جہاں وہ رات احسن کو بیٹھے دیکھ چکی تھی۔آ کا بیٹھے تھے۔اس کی آنکھیں کھلتے ہی ان کے چہرے پر خوشی بکھر گئی۔مسرت سے لبریز آواز میں انہوں نے کہا۔

''میری بیٹی !اللہ کا شکر تو نے آنکھیں کھولیں۔''وہ اس کی پیشانی پر پیار کر رہے تھے۔

''میں یہاں کیسے آئی ہوں آ کا۔''

بیٹے یہاں تمہیں احسن میاں لائے ہیں۔''زرغونہ تم نے یہ کیا کیا؟زندگی اتنی سستی ہے کہ تم نے یوں سوچے سمجھے بغیر اسے ختم کرنے کی کوشش کی۔کچھ تو خیال کیا ہوتا۔تمہارے ساتھ دو زندگیاں وابستہ ہیں۔بیٹے زندگی تو قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہے۔''

بوڑھی آنکھوں میں گہرا کرب تھا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا آ کا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں حیران ہوں۔ میں تو اپنے گھر میں تھی یہاں کیسے آئی۔''

اس کی آنکھوں سے ٹپکتی حیرانی آ کا کو پریشان کر گئی۔

''تو کیا تم نے زہر نہیں کھایا۔''

''کیسا زہر آ کا؟'' وہ حیرت سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''اب میں سمجھا۔ تمہیں مارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب احسن میاں تمہارے گھر پہنچے۔ تم بے ہوش تھیں اور تمہارے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔''

''احسن ہمارے گھر گئے تھے۔'' اس نے استعجاب سے پوچھا۔

''ہاں تمہیں کچھ یاد ہے کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا؟''

''مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد میں نے چائے پی تھی۔ تھوڑی دیر تک پڑھا۔ پھر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ بعد مجھے معلوم نہیں کیا ہوا۔''

''تمہاری اماں کہاں تھی اس وقت؟'' آ کا نے گہرائی تک پہنچنے کے لئے سوال کیا۔

''وہ دوپہر سے کہیں گئی ہوئی تھی۔''

''میں جانتا ہوں یہ سب اس کی سازش ہے۔ اچھا تمہیں چائے کس دی تھی؟''

''ریشماں نے وہ ہماری پرانی نوکرانی ہے۔''

''وہ تمہاری ماں کے کافی قریب ہے نا؟''

''سب نوکروں میں سے اسے غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے۔''

''اب تو شبے کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ تمہیں زہر دے کر ختم کرنا چاہتی تھی۔ قدرت

نے ہماری راہنمائی کی بیٹے۔احسن اچھا بھلا آتش دان کے سامنے بیٹھا تھا۔ایکا ایکی گھبرا کر باہر نکلا۔مجھ سے پوچھنے لگا مجھے کس نے آواز دی ہے میں نے سمجھایا یونہی کبھی کان بجنے لگتے ہیں۔لیکن بیٹے وہ تو تمہاری روح کی پکار تھی ۔کیسے رکتا؟اچھا چھوڑو جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔اب چائے پیو۔"

اسے چائے پلانے کے بعد آکا باہر چلے گئے ۔

یہ وہی کمرہ تھا۔یہ وہی جگہ تھی ۔جہاں اس نے پہلی مرتبہ ہوش میں آنے کے بعد آنکھیں کھولی تھیں ۔ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر قائم تھی ۔ہر شے پرسکون تھا۔لیکن ایک وہ تھی جس کی کشتی گرداب میں پھنسی مسلسل ہچکولے کھارہی تھی ۔کنارے کی تمنا تو وہ کبھی کی چھوڑ چکی تھی ۔اب تو ڈوب جانا چاہتی تھی ۔

قدرت کی کیا مصلحت تھی اسے زندہ رکھنے میں ۔یہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔سنتی تھی کہ شام کے بعد سحر اور مصائب کے بعد آرام ملتا ہے ۔لیکن اس کی شام اتنی طویل تھی کہ اب اسے کسی سحر کا تصور ہی مضحکہ خیز لگتا۔مصائب نے کمر توڑ کر دی تھی اور اب آرام ایک بے معنی سا لفظ بن کر رہ گیا تھا۔

وہ احسن کے ساتھ کسی قسم کا رابطہ رکھنے کے لئے تیار نہ تھی۔سب حالات سے آگاہ ہونے کے باوجود انہوں نے آکا کو بھیجا۔وہ خود کیوں نہ آسکے تھے؟

یہ اس کی آن پر براہ راست ایک چوٹ تھی ۔

دوپہر کو جب احسن اسے دیکھنے کے لئے آئے تو انہیں آکا سے ساری تفصیل کا علم ہوا۔

"ہوں تو زہر خود نہیں کھایا دیا گیا ہے ۔"انہوں نے طویل خاموشی کے بعد کہا۔

اور جب وہ کمرے میں آئے ۔زرغونہ نیم دراز تھی ۔ٹانگیں سمٹی ہوئی تھیں ۔اس

نے آہٹ پر ایک نگاہ غلط انداز ان پر ڈالی اور آہستگی سے کروٹ بدل لی۔

وہ ان سے بات تک کرنا نہیں چاہتی تھی۔

احسن اس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔اس کا رویہ بیزاری کا کھلا اظہار تھا۔سمجھتے تھے وہ ان کی سخت باتوں پر ناراض ہے۔لیکن وہ خود کو قطعی قصوروار بھی نہیں پا رہے تھے۔انہیں بھی اس پر غصہ تھا۔

وہ خاموش کھڑے تھے۔کچھ تذبذب، کچھ ہچکچاہٹ کی کیفیت ان پر طاری تھی۔

''زرغونہ !''انہوں نے کافی دیر بعد پکارا۔

لیکن وہ خاموش رہی۔

احسن کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے۔پھر کمرے سے نکل گئے۔

انہوں نے آ کا کے ہاتھ گولیاں بھیج دیں اور انہیں سمجھا دیا۔

وہ بات کو ابھی طول دینا نہیں چاہتے تھے۔

دو دن گزر گئے۔زرغونہ نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔وہ اگر کمرے میں جاتے بھی تو وہ خاموش پیشانی پر شکنیں ڈالے لیٹی رہتی۔احسن بھی جانے کس بات کے منتظر تھے؟

خاموشی سے تھوڑی دیر بیٹھتے اور چلے آتے۔

تیسرے دن دس بجے وہ کلینک میں مریضوں کو دیکھ رہے تھے کہ گلباز بھاگا بھاگا ان کے پاس آیا۔اس کا سانس پھول رہا تھا۔

''کیوں زرغونہ ٹھیک تو ہے نا؟''انہوں نے اس کے کچھ کہنے سے پیشتر خود ہی پوچھ لیا۔

''وہ جا رہی ہیں۔آ کا انہیں روک رہے ہیں۔میں آپ کو بلانے آیا ہوں۔''

اس کے ساتھ جب وہ گھر پہنچے۔وہ جا چکی تھی۔آ کا آنکھوں میں آنسو لئے

کھڑے تھے۔

تیزی سے اس کے تعاقب میں بھاگے۔حیران تھے کمزوری کے باوجود وہ اتنا فاصلہ کیسے طے کر گئی ہے؟

کافی دور جا کرانہوں نے اُسے پکڑلیا۔

''زرغونہ کہاں جانا چاہتی ہوتم؟''

انہیں اس پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

''اپنی غلیظ دنیا میں۔''اس نے مڑے بغیر جواب دیا۔

''پاگل ہوگئی ہو۔''انہوں نے اسے بازو سے تھام لیا تھا۔

''زرغونہ !میری جگہ پر آ کر سوچو اور اس کے بعد فیصلہ کرو۔''

''میں صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں ۔آپ مجھے اٹھا کر کیوں لائے؟''اس کی آواز میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔

''مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

''میری ضرورت ؟۔۔۔میری؟مجھ جیسی پست کردار اور ننگ انسانیت لڑکی ۔۔۔احسن رضا آپ کو کیا ہو گیا ہے؟''

اس نے اپنے سینے میں کھبے تیروں کو ایک ایک کر کے نکالا۔

''وضاحت سے پیشتر میں جاننا چاہتا ہوں مجھے لاعلمی میں کیوں رکھا گیا؟''

''میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھتی ۔مجھے جانے دیجئے۔''

اس نے زہر گھلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم جانا چاہتی ہو؟''

''ہاں !اس نے اپنے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

''زرغونہ !انہوں نے شانوں سے پکڑ کر اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔ان کے چہرے پر گہرا اضطراب تھا۔

''تم جا نہیں سکتی ہو۔''ان کا فیصلہ اٹل تھا۔

''لیکن گناہوں کی زندگی بسر کرنے اور بھولے بھالے معصوم لوگوں کا شکار کرنے والے آپ جیسے پارسا انسانوں کے ساتھ کیسے رہ سکتے ہیں؟''اس نے طنز کا ایک اور تیر چلایا۔

''پارسائی کسی کی خاندانی میراث نہیں؟''انہوں نے اس کے الفاظ اسے لوٹا دیئے۔

''کیوں نہیں آپ لوگوں کے گھر کی تو وہ باندی ہے۔آپ لوگ تو اس کے ٹھیکیدار ہیں۔کوئی دوسرا انسان یہ دعویٰ کیسے کرسکتا ہے؟''اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

ان پے در پے حملوں سے وہ تلملا اٹھے تھے۔

''زرغونہ تمہیں میری جگہ پر آ کر سوچنا چاہئے۔'' ان کی آواز میں قدرے غصہ تھا۔

''سوچا تھا۔غور کیا تھا۔اور آپ کو قطعی بے قصور سمجھا تھا۔لیکن میرے گھر میں آ کا کی آمد نے مجھے یہ احساس دلایا کہ آپ نے خود کو کیا اور مجھے کیا سمجھا ہے؟میں یہ نہیں پوچھنا چاہتی کہ آپ کی غلط فہمی کیونکر رفع ہوئی ؟لیکن ذہن صاف ہو جانے کے بعد آپ کے طرز سلوک پر مجھے افسوس نہیں دکھ ہے۔آپ کہتے ہیں میں نے آپ کو تاریکی میں رکھا؟''

اس کی آواز یک دم بھرا گئی۔سارا جوش بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔

''احسن میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔آپ بھول گئے ہیں آپ کی

آنکھوں نے مجھے ایک پیغام دیا تھا۔آپ نے چند میٹھے بول بولے تھے۔میں نے تو خود کو اسی دن ہار دیا تھا۔جب بھی خودکشی کی کوشش کی ایک پرشفقت وخلوص میں ڈوبی آواز میرے کانوں میں گونجتی۔دو روشن آنکھیں میری آنکھوں پر جھک آتیں۔میرے دل نے آپ کو ایک بار صرف ایک بار دیکھنے کے لئے کتنی دعائیں مانگیں۔

اور جب آپ ملے تو کیا میں ماضی کی گھناؤنی تصویر دکھا کر آپ سے پیار کی بھیک مانگتی؟''اس نے پوشیدہ زخموں پر سے پردہ ہٹایا۔

''احسن !میں آپ سے پیار کیا تھا۔لیکن آپ نے......''اس کی آواز ہچکیوں میں ڈوب گئی۔

اور انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کی روح کو کوئی وزنی پتھروں سے زخمی کر رہا ہو۔

کچھ کہے بغیر انہوں نے اُسے اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔اور دبلا پتلا تھکا ہارا زخموں سے چور زرغونہ کا وجود ان کے مضبوط اور پرجوش وجود کے سامنے کوئی مزاحمت نہ کر سکا۔سر بے اختیار ان کی چوڑی چھاتی سے لگ گیا۔

وہ سسک رہی تھی۔اس کے آنسو ان کے اوور آل کو بھگو رہے تھے۔

وہ جھک گئے اپنے ہونٹ اس کے بالوں پر رکھتے ہوئے کتنی دل سوز آواز میں انہوں نے کہا۔

''زرغونہ !میں معافی چاہتا ہوں۔''

''چٹان کی طرح اٹل ان کی ہستی زرغونہ کے آنسوؤں نے پگھلا ڈالی تھی۔آنکھیں وفورِ جذبات سے بند ہوگئی تھی۔

سورج چمک رہا تھا۔قدرے سبز اور سیاہی مائل پہاڑیوں پر پڑی برف شبنم کے قطروں میں بدل رہی تھی۔

اور وہ کیف وسرور کی ایک انوکھی دنیا میں تھے۔

زرغونہ کی سسکیاں مدھم ہوتے ہوتے رک گئی تھیں۔

کتنی دیر گزر گئی۔انہوں نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اوپر اٹھایا۔گھنیری بھیگی پلکوں نے آنکھوں کو ڈھانپا ہوا تھا۔

''زرغونہ !''ان کی آواز پیار کی شدت سے بوجھل تھی۔

تمہیں بھولنا چاہا لیکن بھلا نہ سکا۔تمہاری یادوں سے کنارہ کشی کرنی چاہی۔لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔تم تو وجود کا ایک حصہ بن گئی تھیں۔جسے کاٹ پھینکنا میرے بس کا روگ نہ تھا۔زرغونہ !احسن کو تمہاری ضرورت ہے ورنہ وہ زندہ نہ رہ سکے گا۔''

اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا سنجیدہ سنجیدہ روشن آنکھیں محبت کی شعاعوں سے چمک رہی تھیں۔

آہستگی سے کسی نازک پھول کی طرح اس نے اپنا سر ان کے شانے پر رکھ دیا۔

''زرغونہ !میری زندگی !''وہ اس کے سیاہ ریشمی بالوں پر جھک گئے۔

باب نمبر:۴۱

چل دفع ہو۔ پرے ہٹ اب۔اس پرہیز گار بی بی کو دیکھ آنے دے کہ وہ جنت میں پہنچ گئی ہے یا ابھی راستہ ہی طے کر رہی ہے۔'' ریشماں نے جواں ملازم بخشو کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''چھوڑو جنت میں جائے یا جہنم میں ہمیں کیا؟ ارے پاگل اتنے دنوں بعد کہیں مل کر بیٹھنے کا موقع ملا ہے۔اور اسے بھی یوں ضائع کر رہی ہو؟'' بخشو نے لجاجت سے لپکتے ہوئے اس کا آنچل پکڑ لیا۔

''بابا دیکھ تو آنے دو۔ویسے مکمل خاتمہ صبح سے پہلے نہیں ہونے کا۔'' وہ غایت اطمینان سے بولی۔

''ریشماں میری جان ! ایک بات ہے تو نے مصیبت کو دعوت دی ہے۔جب تحقیقات ہو گی تو تمہیں بھی پکڑا جائے گا۔''

''واہ واہ مجھے کیوں پکڑا جائے گا؟ تمہیں معلوم ہے آمیزہ ساری چینی میں ملایا گیا

ہے۔ملازموں سے باز پرس تو ضروری ہے۔لیکن بات تو آگے پہنچ جائے گی۔ویسے بھی اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو بائی جی جانیں اور ان کا کام۔''

اس نے عیاری سے دیدے گھمائے۔

''کہتے ہیں جب گیدڑ کی موت آتی ہے وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔''بائی جی بھی اپنی موت کو بلا رہی ہے۔پولیس پولیس ہے میری جان ! بال کی کھال اتار کر رکھ دیتی ہے بائی جی بڑی چالاک بنتی پھرتی ہیں۔''

''ارے چھوڑ کیسی بزدلوں کی سی باتیں کرتا ہے۔بائی جی کھڑے کھڑے انسانوں کا سودا کر دیں۔تم نے کیا سمجھا ہے؟''

''وہ کب آ رہی ہیں؟''اس نے پوچھا۔

''تین چار بجے سے پہلے تو کسی صورت آنے والی نہیں۔ساری رات گانا بجانا پڑا ہوگا۔ممکن ہے کچھ اور بھی ہوا ہو۔صبح سے پہلے تو امید نہیں۔''

''تو اس وقت تک لاش پڑی رہے گی۔''

''تو اور کیا میں سنبھالوں گی؟خود ہی آ کر جو غل غپاڑہ مچانا چاہے گی مچائے۔''

''تمہیں کچھ کہہ کر گئی ہیں یا نہیں؟''

''مجھے تو کہہ گئی تھیں۔پولیس کو فون کر دینا لیکن میں نہیں کروں گی۔وہ جانے اور اس کا کام۔''

''ریشماں مجھے تو خوف آ رہا ہے۔پولیس کہیں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہ پہنا دے۔مجھے کیوں پہنائے گی۔وہ پہنے گی۔''

''ہاں یہ الٹی سیدھی باتوں سے میرا مغز نہ چاٹ۔زبان سے کوئی ڈھنگ کی بات نکال۔''وہ غصے سے اس کے دو ہتڑ مارتے ہوئے بولی۔

''تیرے بھلے کو کہہ رہا ہوں ۔ویسے آج ہماری پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے۔سبھی عیش کر رہے ہیں نوری اور اللہ دتا بھی مصروف کار ہیں۔اچھا ریشماں یہ بائی جی نے اب مجروں پر جانا کیوں کم کر دیا؟''بخشو نے استفسار کیا۔

''بیٹی جو لاکھوں کما رہی ہے۔کیا ضرورت ہے گلا پھاڑنے کی۔''

لیکن سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو تو وہ ذبح کر رہی ہے۔کیا ہوگا پھر۔''

اس نے ٹوہ لینے کی کوشش کی۔

''میں کیا جانوں کچھ سوچا ہی ہوگا اس نے۔''

پلو چھڑا کر ریشماں زرغونہ کے کمرے میں آئی۔

پردہ اٹھایا۔لیکن وہ کیا دیکھ رہی تھی؟ پاؤں وہیں زمین میں گڑ گئے۔آنکھیں خوفناک حد تک پھٹ گئیں ۔وہ کیا دیکھ رہی تھی ۔اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

بستر خالی تھا۔کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہے؟ کیا ہے؟''اس کا دماغ گھوم گیا۔

''کیا یہ ممکن ہے۔زرغونہ کو وہ جس حالت میں چھوڑ کر گئی تھی اس صورت میں اٹھنے کا امکان چھوڑ سوال ہی نہ تھا۔''

تیزی سے ملحقہ باتھ روم میں گئی ۔وہاں کیا تھا؟ واپس آئی ۔کمرے کا کونہ کونہ چھان مارا۔گوشت پوست کی انسان تھی جسے وہ سوئی کی طرح ڈھونڈھ رہی تھی ۔

اپنی حماقت پر اسے خود ہی غصہ آ رہا تھا۔

وہ چکرا رہی تھی۔بلاشبہ چکرانے والی بات تھی ۔

ایسی حالت میں انسان اٹھ کر کہاں جا سکتا ہے؟

کمرے سے نکلی سب کمروں میں گھومی۔یہ جاننے کے باوجود کہ گھومنا بے کار ہے

وہ گھوم رہی تھی ۔ذہن کچھ سمجھ ہی نہیں رہا تھا ۔اسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی ۔

''بخشو !'' کمرے میں آکر اس نے سہمی سہمی آواز میں پکارا۔

''کیا ہوا ریشماں ؟'' اس نے اس کی اڑی اڑی رنگت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کمبخت ہونا کیا ہے ۔زرغونہ بی بی کمرے میں نہیں ہیں ۔''

''ہیں کیا کہہ رہی ہو؟'' مردہ کبھی چل بھی سکتا ہے؟''

''فضول باتیں نہ بناؤ۔یہ سوچو اب کیا کرنا چاہئے؟'' اس نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''بھئی مجھے تمہاری بات پر ہی یقین نہیں آرہا۔سوچوں کیا؟ میں نے خود کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تھا۔اس پر بے ہوشی طاری تھی ۔''

''نہیں یقین آرہا ہے تو چل کر دیکھ لو۔''

وہ اٹھا اور اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا زرغونہ کے کمرے تک آگیا ۔واقعی بستر خالی تھا۔سفید شکن آلود چادر منہ چڑا رہی تھی ۔

''یہ کیا معمہ ہے؟ جس حالت میں میں نے اسے دیکھا تھا اس میں اٹھنے یا چلنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا؟''

''اب کیا کیا جائے ؟'' ریشماں پریشان ہو رہی تھی ۔

''چلو ذرا لان میں چل کر دیکھتے ہیں ۔''

لان میں دیکھا گیا ۔ہر جگہ کی تلاشی لی گئی ۔گیٹ پر نظر پڑ گئی گیٹ کھلا تھا۔

''گیٹ تو بند تھا اسے کس نے کھولا ہے؟'' ریشماں چلائی ۔

فیضو کو اس کی کوٹھڑی سے باہر نکالا گیا ۔غریب سو رہا تھا اس سے پوچھا گیا ۔اس نے بتایا کہ اس نے گیٹ اندر سے بند کیا تھا۔

''حرامی تو نے تالا کیوں نہیں لگایا؟'' ریشماں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''اچھا تیری ہڈیوں کو مالش کی ضرورت تھی کل بائی جی مالش کر دیں گی۔ زرغونہ بی بی غائب ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' فیضو نے آنکھیں نکالیں۔

''مطلب میں اب تجھ عقل کے اندھے کو سمجھاوں۔اتنا میرا دماغ فالتو نہیں۔''

''لیکن انہوں نے کہاں جانا ہے؟ اپنی سہیلی کے ہاں گئی ہوں گی۔''

''ٹر ٹر مت کر۔'' اس نے نحیف و نزار فیضو پر غصہ جھاڑا۔

بے چارہ سہم کر رہ گیا۔مقابلہ کرتا تو نوکری سے جواب پاتا۔

صورتحال بہت پیچیدہ ہو گئی تھی۔بھلا کسی سے کچھ کہا جا سکتا تھا جب تک ممتاز بائی نہ آتی۔

''اسے وہ بڈھا نہ لے گیا ہو؟'' ریشماں نے قیاس آرائی کی۔

''کون بڈھا؟'' بخشو نے حیرانی سے پوچھا۔

''میرا دماغ مت چاٹ میں اس وقت کچھ نہیں بتا سکتی۔میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں بائی کو کیا جواب دوں گی؟ وہ میری جان کو آ جائیں گی۔''

''کیوں تمہاری کیا خطا ہے؟'' بخشو نے خوشامد کرتے ہوئے کہا۔

''وہ خطا اور بے خطا کو کیا جانیں گی۔''

مزید تحقیق کرنے کی بجائے اس نے سوچا کہ ممتاز بائی کے آنے کا انتظار کرے۔

باب نمبر:۴۲

چائے کا تیسرا دور چل رہا تھا۔ہر بار اس نے کوشش کی لیکن ہر بار ناکام رہی ۔لیکن اس بار قسمت یاوری کر گئی۔داؤ چل گیا ۔سرلا بائی کام سے باہر گئی۔اور اطمینان سے اس نے وہ کرلیا جو وہ کرنا چاہتی تھی۔

شائقین بے قرار ہو رہے تھے۔چائے ختم ہوتے ہی شور مچنا شروع ہو گیا۔

''ہو جائے پھر ایک پھڑکتی غزل۔''

''ایک شاندار غزل سبینہ کے نام پر۔'' کسی دل پھینک نے نعرہ لگایا۔

وہ بھی خوب ترنگ میں تھی۔استادلوگوں کو اشارہ کیا اور اس نے ساحر کی غزل چھیڑ دی۔

ہوس نصیب نظر کو کہیں قرار نہیں !
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں
ہمیں سے رنگ گلستان ہمیں سے رنگ بہار

ہمیں کو نظم گلستاں پہ اختیار نہیں
ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مضطرب !
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں
تمہارے عہد وفا کو میں کیا سمجھوں
مجھے خود اپنی محبت پہ اعتبار نہیں
نہ جانے کتنے گلے اس میں مضطرب ہیں ندیم !

''تمہاری زرغونہ سے کوئی بات ہوئی پھر۔'' سرلابائی نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اُس کا مختصر سا جواب تھا۔

تھوڑی سی بات چیت دونوں کے درمیان تقریب کے حوالے سے ہوئی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

وہ گہرائی تک جانا چاہتی تھی۔

سرلابائی کو محسوس ہوا تھا کہ اس کی باتوں میں عجیب رکھائی سی تھی۔ ایسی گفتگو کی سرلابائی عادی نہ تھی۔ کچھ سوچتے ہوئے چپ کر گئی۔

کار گھر کے قریب آ رہی تھی اور اس کی پریشانی میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ فلمی دنیا کی نامور اداکارہ مر جائے اور کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم ہونا چاہیے تھا۔

کار گیٹ میں داخل ہوئی۔ گھر سنجیدہ خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''یہ.....یہ سب کیا ہے..........یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟'' اُس نے اپنے دل میں کہا۔

یہاں خاموشی کیوں ہے؟ یہ سکون کیسا ہے؟ یہاں ہلچل مچی ہوتی چاہیے

تھی ۔لوگوں کا ایک جم غفیر ہوتا ۔پولیس گشت کرتی ہوئی چاہیے تھی ۔۔۔'' کیا ریشماں میری طرح ناکام ہوگئی ۔کیا وہ بھی مقصد حاصل نہ سکی ۔کتیا بدذات مجھے تو مجبوری نے جکڑ لیا لیکن تجھ پر کون سی مصیبت ٹوٹی جس نے تجھے اپاہج کر دیا۔''

اُسے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے ۔تھکی ہاری کار سے اتری ۔وہ چل رہی تھی اور اپنی ہی چاپ میں اپنی شکست کی آواز سن رہی تھی ۔وہ اُسے سننا نہیں چاہتی تھی ۔

''سرلا تم خود میرے لئے چائے بناؤ۔اور ریشماں کو فوراً میرے پاس بھیج دو ۔میں اس سے بدن دبوانا چاہتی ہوں ۔''

''کیوں ری حرافہ ! کوڑھ لگ گئی تھی تیرے ہاتھوں میں جو چھلنی ہو گئے ۔اور تو کام نہ کر سکی ؟''

اس نے سہمی سہمی ریشماں پر نگاہوں سے آگ برساتے ہوئے کہا۔

''بائی جی آپ ناراض نہ ہوں کچھ میری بھی سن لیں ۔''اس نے عاجزی سے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے ۔

''سناؤ نمک حرام !تمہاری تو کھال ادھیڑ دینی چاہئے ۔تم لوگوں میں ذمہ داری تو رہی نہیں ۔''اپنی شکست کا بدلہ وہ اسے گالی گلوچ دے کر اتارنا چاہتی تھی ۔

''میں کیا بک رہی ہو؟''اس نے آنکھیں پھاڑیں ۔

''اللہ قسم بائی جی منہ میں کیڑے چلیں جو جھوٹ ہو۔''

''یہ کس وقت کی بات ہے؟ یہی کوئی نو دس بجے کی ۔''

''حرام زادی !تو کیسے سوگئی تھی ۔میرے گھر سے جانے کی دیر اور تمہاری باگیں دراز ۔''سرلا بائی چائے لے آئی ۔اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھے ۔ریشماں کو سہمے ہوئے پاس کھڑے دیکھا۔

''کیا ہوا؟''

''نیا شگوفہ کھلا۔زرغونہ رات سے غائب ہے۔''

''ہوں !''اس نے چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ممتاز بائی کو گھورا۔

''ممکن ہے سمیعہ کے ہاں ہو۔''

''کہاں اسے بستر پر سوتے دیکھا۔دس پندرہ منٹ بعد اس کے کمرے میں کسی کام سے گئی تو بستر خالی تھا۔''

''سمیعہ کو فون کیا تھا۔''

''سر لا مجھے لگتا ہے وہ لوگ اُسے لے گئے ہیں۔''اس نے سر پلنگ سے ٹکراتے ہوئے کہا۔

''کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔کون لے گئے ہیں اور کیوں لے گئے ہیں۔وہ اگر گئی ہوگی تو اپنی مرضی سے۔اس پر کوئی پابندی تھی اپنی مرضی سے وہ جہاں چاہے آتی جاتی ہے۔''سر لا بائی کو حقیقت کا کیا علم تھا۔وہ اپنے حساب بولے چلی جا رہی تھی۔

''فون اٹھاؤ۔''اس نے ریشماں سے کہا۔

نواز علی کو فون کر کے اس نے فوراً آنے کے لئے کہا۔

اور جب وہ آیا تو سارا معاملہ اس کے سامنے رکھا گیا۔زہر دینے کی بات البتہ اس سے چھپائی گئی۔

''تمہارے پاس پتہ ہے؟''۔۔۔نواز علی نے پوچھا۔

''ہاں''دیکھتی ہوں کہتے ہوئے وہ اٹھی۔لیکن تلاش بسیار کے باوجود پتے کی چٹ جسے اس نے سنبھال کر رکھا تھا۔نہیں مل رہی تھی۔ساری چیزیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔سر لا بائی نے اس کے اندر کے اضطراب کو محسوس کیا تو بولی۔

''یوں اگر ڈھونڈ نا چاہو گی بھی تو نہیں ملے گی ۔اطمینان سے ڈھونڈو۔''

''میں نے اسی بکس میں رکھی تھی ۔اچھی طرح یاد ہے ۔آہ سرلا میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی ہے ۔کیا کہوں اور کیا نہ کہوں ۔''اس نے رقت بھری آواز میں کہا۔

''کس محنت سے میں نے یہ پتہ حاصل کیا تھا۔اور کیسے اِسے سنبھال کر رکھا۔انتہائی کاوش سے حاصل کیا تھا۔مگر دیکھو تو سہی ۔''اسے اپنے آپ پر شدید غصہ آ رہا تھا۔جھنجھلاتے ہوئے وہ بکسوں کو ادھر ادھر پٹخ رہی تھی ۔

''تم ہٹو میں دیکھتی ہوں ۔''سرلا بائی آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

ایک ایک چیز نکال کر دیکھ لی گئی ۔ہر چیز کا جائزہ لیا گیا ۔لیکن چٹ نہ ملنا تھی نہ ملی ۔معلوم ہوتا تھا زرغونہ کی طرح اسے بھی پر لگ گئے تھے ۔

''سرلا !اب کیا ہو گا میری دشمن دغا دے کر نکل گئی ۔بولنا۔''

اس نے تو منزل پالی اور ہمیں تاریکوں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ گئی۔''

''حد کرتی ہو تم بھی ،حوصلہ رکھو۔ایسی کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے ۔وہاں چلی گئی ہے تو اسے واپس بھی تو لایا جا سکتا ہے ۔''نواز علی نے کمرے میں آ کر ممتاز بائی کو حوصلہ دیا۔

''ایسے حسین خواب نہ دکھاؤ نواز ۔مجھے محسوس ہوتا ہے وہ میری جھولی میں راکھ ڈال کر ہمیشہ کے لئے چلی گئی ہے ۔''

''دیکھو ممتاز گھبراہٹ بعض دفعہ بنتا کام بگاڑ دیا کرتی ہے ۔تم پتہ تلاش کرو۔میں جاتا ہوں کچھ ضروری کام ہیں ۔رات یا صبح میں پھر آؤں گا۔اور ہاں ہر بات راز میں رہے ۔''

''نواز ا میری خبر لینا ۔''

شیر کی طرح گرجتی برستی عورت مجبوری کی ایک تصویر بنی ہوئی تھی ۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' اُس نے اس کے شانے تھپتھپائے ۔

''سرلا وہ ایک بار میرے ہاتھ لگ جائے ۔صرف ایک بار اس کے خون سے اپنی پیاس بجھانا چاہتی ہوں ۔

اس کے گوشت کو چیلوں کے آگے ڈالنا چاہتی ہوں ۔میری دشمن میری ازلی رقیب ۔'' وہ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر غصے سے چلا رہی تھی ۔

''ممتاز تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے آہستہ بولو۔کیا ساری دنیا کو خبر کرنی ہے ۔''

''ہاں !''اس نے پیشانی دیوار سے ٹکرائی ۔

''یہ خبر کل بھی تو لوگ سنیں گے ۔سرلا اسے کب تک چھپاؤ گی؟''۔۔۔۔

''سرلا !''وہ چیخ اٹھی۔

''میں نے تم سے کیا کہا تھا؟لیکن تم نے میری ایک نہ مانی ۔''

سرلا بائی جھکی جھکی آنکھوں سے بکس ٹٹولنے میں لگی رہی چیٹ نہ ملنا تھی نہ ملی ۔اور پتہ دوبارہ حاصل کرنے میں چار دن گزر گئے ۔جوں ہی ایڈریس ملا۔ممتاز بائی جانے کے لئے فوراً تیار ہو گئی لیکن نواز علی نے سمجھا بجھا کر روکا اور خود چلا گیا ۔

دو دن اس نے کانٹوں پر گزارے ۔راتوں کو اٹھ اٹھ کر بھاگتی ۔عجیب وغریب حرکتیں کرتی ۔سرلا بائی اُسے سنبھالتی سنبھالتی تھک گئی ۔لیکن وہ تو ہاتھوں سے نکل نکل جا رہی تھی ۔

اور ایک ڈھلتی شام کو جب اس نے اپنے کمرے میں نواز علی کو سر جھکائے داخل ہوتے دیکھا تو پاگلوں کی طرح دروازے کی طرف دوڑی ۔''ممتاز کہاں بھاگی جا رہی ہو؟ مجھے افسوس ہے نا کام واپس لوٹا ہوں ۔اسے سب ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ ۔وہ اس دنیا

میں پہنچ چکی ہے۔جہاں سے اسے کوئی طاقت واپس نہیں لا سکتی۔"

''ہا ہا ہا ہا۔''اس نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

''سرلا بائی !!اور نوکر اتنا بے ہنگم قہقہہ سن کر اپنے اپنے کمروں سے نکل کر بھاگے۔اسے دیکھا تو سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

وہ قہقہے لگا رہی تھی۔خوشی سے تالیاں پیٹ رہی تھی اور کمرے میں بھاگتی پھر رہی تھی۔نواز علی ہارمونیم کے پاس کھڑا گم صم اسے دیکھ رہا تھا۔

''۔۔۔ممتاز کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ہوش کرو۔کچھ انوکھی بات تو نہیں ہوئی۔تمہیں تو اس کے لئے بہت عرصہ پہلے تیار رہنا چاہئے تھا۔''نواز علی نے کہا۔

''تم کہتے ہو میں......ہوش ....کروں ....ہاہاہا نواز میں........نے جس........پر اعتماد کیا.........اس نے ....مجھے ....دھوکا.....دیا.....تم خالی.......ہاتھ آئے.........ہو..........اور مجھے ....کہتے ....ہو کہ کوئی.........بات ....نہیں ....تم.......اسے جان بوجھ ....کر نہیں............لائے۔رنگ رلیاں منانے........کے لئے ....چھوڑ.........آئے.........ہو بہت ....برے ....ہو تم نواز......''

اس کی آنکھوں میں ہنسی تھی۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔وہ مستانہ نظروں سے انگلی فضا میں لہراتے ہوئے اسے یہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔وہ رکی اس نے ایکا ایکی زور سے تالی بجائی۔اپنے سینے پر ایک دوہتڑ مارا اور گرجی۔اب میں جاؤں گی۔میں جاؤں گی۔اس کو میں لاؤں گی۔ہا ہا ہا اس نے قہقہہ لگایا۔فلک شگاف قہقہہ در و دیوار بج اٹھے۔وہ سرلا کی طرف گھومی۔جو حیرت زدہ کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

''سرلا ''اس نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''میں پیاسی ہوں۔دیکھو سرلا میرے ہونٹ جل رہے ہیں۔یہاں آگ لگی ہےاس نے اپنے کلیجہ کی طرف اشارہ کیا۔یہ پیاس یہ جلن ۔یہ آگ بڑھ رہی ہے۔سرلا مجھے اس کا خون چاہئے اس کا خون ۔ہا ہا ہا خون..............میں پیوں گی.........اور گوشت ....کتے کھالیں گے........نواز.....اس کا سراس کے شانے پر جھک گیا۔آنکھیں بند ہوگئیں سرلا اس کو بازوؤں میں تھامے بستر کی طرف لانے لگی۔تو تڑپ کر وہ پھر سیدھی ہوگئی۔۔۔۔۔۔میں اس کا خون پیوں گی،خون پیوں گی خون پیوں گی۔وہ باہر کی طرف بھاگی۔سرلا اور نواز نے اُسے روکنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اس کی پیشانی چوکھٹ سے ٹکرائی۔گرم گرم خون ابل پڑا۔تازہ خون رخساروں سے بہتا ہوا جب اس کے ہونٹوں سے لگا تو وہ ایک دم قہقہے لگانے لگی۔

''آہا..........دیکھو.........دیکھو.........سرلا دیکھو میں..........نے کبھی........شکست نہیں.........مانی.........میں..........کامیاب ہوئی ہوں.......میں اس کا خون..........پی رہی ہوں۔''

اس نے تازہ سرخ خون کو اپنی ہتھیلیوں پر دیکھا۔''بے قابو ہو کر پھر ان کی گرفت سے بھاگنے لگی.......جانے ....وہ.......مجھے.......کتے.......بے چارے .....بھوکے ہیں۔اس کا گوشت.........انہیں بھی کھلاؤں۔سرلا یہ.........دن ....مجھے زمانوں بعد نصیب.......ہوا.........ہے۔

میں........کتنی.....خوش قسمت ہوں.......فاتح ہوں.........میں...''

نواز علی ڈاکٹر کو فون کر کے واپس کمرے میں آیا۔اس وقت تک وہ باہر برآمدے میں سرلا کی گرفت سے آزاد ہو کر بھاگ رہی تھی۔نواز نے اسے مضبوطی سے تھاما۔اس کے ماتھے پر زخم کی جگہ اپنا ہاتھ رکھا۔

پھر وہ وہیں برآمدے میں نڈھال نواز کی گرفت میں ڈھے سی گئی۔

نواز اس کی آواز بے چارگی کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔

میں ہار......گئی......ہوں.....میں.....میں........میں......

زندگی کی سب سے......بڑی بازی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔اس کا جسم ڈھیلا پڑنے لگا نواز اور سرلا بائی نے دکھ اور تاسف سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے سر جھکا لئے تھے۔

حرفِ آخر

24دسمبر 1970ء

صدر بازار، لاہور چھاؤنی